لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

"خدا کی قسم میں کنواری ہوں" اور

جذبات میں زلزلے بپا کر دینے والی، ہنگامہ خیز آٹھ سچی کہانیاں

صابر حسین راجپوت

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

"خدا کی قسم میں کنواری ہوں" اور

جذبات میں زلزلے بپا کر دینے والی، ہنگامہ خیز آٹھ سچی کہانیاں

پسندیدہ موبائل وڈائیجسٹ کرا ایڈوانس ادائیگی کر کے
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مجددیہ روڈ محلہ عیدگاہ روڈ ٹوبہ
0001006

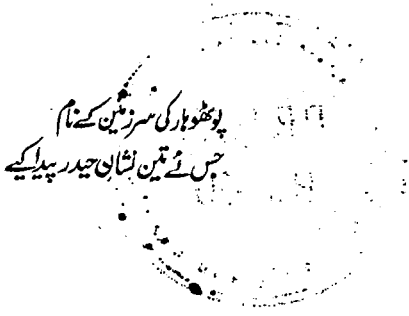
پوٹھوہار کی سرزمین کے نام
جس نے تین نشانِ حیدر پیدا کیے

فہرست

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

شہباز اور فاطمہ

جیکی بیچاری کا کیا قصور

پوٹھوہار میں ریچھ کہاں

نمازِ جنازہ پڑھی جا چکی تھی

خدا کی قسم میں کنواری ہوں

دو قبروں کی کہانی

وہ تھا تو کتا، لیکن ....

صابر حسین راجپوت میری دریافت ہے۔

اُردو ادب کے ساتھ صابر حسین راجپوت کا دُور پار کا بھی تعلق نہیں۔ وہ افسانہ نویس نہیں، ناول نگار بھی نہیں، سراپا حقیقت ہیں۔ آدھی صدی گزری، انہوں نے دس جماعتیں پاس کی تھیں۔ اب اُن کی عمر چار کم اَسّی سال ہے۔ کہتے ہیں "میٹرک کا سرٹیفکیٹ تو محفوظ ہے، تختی دُھل گئی ہے۔ کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ کیا پڑھا تھا سوائے اس کے کہ دس جماعتیں پاس کی تھیں" —— میٹرک کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے انہوں نے ٹرنک میں رکھ دیا اور جوانی کُتوں کے ساتھ گیدڑوں اور خرگوشوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزار دی اور اب بڑھاپا جوانی کی یادوں میں گزار رہے ہیں۔ اُن کی زندگی کے چھہتر سال گاؤں میں گذرے ہیں۔ گاؤں بھی ایسا جہاں اب بھی کوئی پکی سڑک نہیں جاتی۔

صابر حسین راجپوت سے میری ملاقات اتفاقیہ نہیں، ایک پروگرام کے تحت

ہوتی تھی۔ یہ میرا ایک تجرباتی پروگرام تھا جو اُردو زبان کے بہت سے ڈائجسٹ پرچوں میں شکار، دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات اور مہم جوئی (ایڈونچر) کی انگریزی کہانیوں کے ترجمے پڑھ کر میرے ذہن میں آیا تھا۔ ڈائجسٹ پرچوں کی کامیابی کا راز بھی کہانیاں تھیں۔ اب بھی یہ پرچے اچھی ترجموں کے زور پر چل رہے ہیں۔ ان میں اب انہوں نے عریانی اور جنسی لذت کو شامل کر کے ایٹم کا نشہ پیدا کر لیا ہے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان پرچوں میں جنگِ عظیم میں امریکیوں، انگریزوں، جاپانیوں اور جرمنوں کی بہادری کے قصے تو شائع کئے جاتے ہیں مگر پاکستان نے اپنے ازلی دشمن سے جو جنگیں لڑی ہیں اُن کو ان پرچوں میں جگہ نہیں دی جاتی۔ شکار اور مہم جوئی وغیرہ کے متعلق بھی اُن کا رویہ یہی ہے۔

پرچوں میں مزید لذت پیدا کرنے کے لیے دو تین ڈائجسٹ رسالوں نے ہندو مت کی دیومالائی داستانیں شروع کر رکھی ہیں جن میں جنسی لذت میں لپٹا ہوا ہندو مذہب پیش کیا جا رہا ہے اور ہمارے نوجوان ایک نشے کی کیفیت میں ہندوازم کو قبول کرتے جا رہے ہیں۔ یہ پاکستان کے خلاف ایک سازش بھی ہے اور دولت کمانے کا ذریعہ بھی۔ یہ اسلام دشمن لٹریچر ہمارے ہاں مقبولِ عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔

احساسِ کمتری کے مارے ہوئے یہ پاکستانی ایڈیٹر اپنے آپ کو یقین دلائے بیٹھے ہیں کہ بہادری اور دلیری کی سچی کہانیاں صرف امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں ہی ملتی ہیں، پاکستان میں نہیں۔ بات کہاں۔ اس کے علاوہ ترجمہ کر لینا آسان ہوتا ہے۔ گھر بیٹھے بیٹھے ہی بنائی کمائی مل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی تو تاریخ اور پیرِ پیر سرزمین ڈرامائی اور سنسنی خیز کہانیوں سے بھری پڑی

ہے۔ ہمارے ایڈیٹروں اور رائٹروں کی مشکل یہ ہے کہ ان کہانیوں کی تلاش میں کُرسی سے اُٹھنا پڑتا ہے۔ ان سچی وارداتوں کے کردار زیادہ تر اَن پڑھ ہوتے ہیں، دُور دراز دیہات میں رہتے ہیں۔ ان تک پہنچنے کے لیے پاپیادہ بھی سفر کرنا پڑتا ہے اور پھر اُن سے کہانی سُن کر لکھنی بھی پڑتی ہے۔ اس جھنجھٹ میں کون پڑے؟ تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ کباڑی سے برسوں پُرانے انگریزی رسالے خرید لئے اور کہانیاں ترجمہ کر کے چھاپ دیں؟

مَیں نے ابتدا میں جب اس طرف توجہ دی تو یہ ترجمے پڑھ کر خیال آیا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے میں اور میرے اپنے علاقے پوٹھوہار میں اس سے زیادہ ڈرامائی اور حیرت انگیز کہانیاں مل سکتی ہیں جن میں نہ صرف تفریحی سنسنی خیزی ہے بلکہ نوجوانوں کے کردار کو پختہ کرنے کا سامان بھی ملتا ہے۔ مجھے ڈرایا گیا کہ پڑھنے والے صرف ترجمے پسند کرتے ہیں، مقامی کہانیاں شائع کرو گے تو پرچے کو لے ڈوبو گے۔ مَیں پرچے کے ساتھ خود بھی ڈوبنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مَیں نے بسم اللہ ایک ایسے کردار سے کی جس کے ہاتھوں میں مَیں پلا اور جوان ہُوا تھا۔ یہ وہ شخصیت تھی جنہوں نے پہلی جنگِ عظیم میں تُرکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ نے "حکایت" کے بسم اللہ کے شمارے میں "وہ تُرکوں کے خلاف نہ لڑے" کے عنوان سے اِن کی کہانی پڑھی ہو گی۔ کیا آپ کو ایسی ڈرامائی داستان کسی انگریزی رسالے سے مل سکتی ہے؟

اس کے پہلے یا شاید ذرا بعد مَیں نے "سرور پنجابی شہید" کے عنوان سے ایک پوٹھوہاری سپاہی کی شجاعت اور خودداری کی سچی کہانی لکھی تھی جو انگریز کی فوج

کا سپاہی ہوتے ہوئے انگریز کی فوج سے بھاگ کر رائفل اور ایمونیشن سمیت قبائلی پٹھانوں سے جا ملا تھا۔ مَیں جب ۴۰-۱۹۳۹ کی اس بھولی بسری سچی کہانی کی تفصیلات اکٹھی کر رہا تھا تو ایک اور کردار اور ایک اور کہانی سامنے آگئی۔ اُس دور میں جب سرور پنجابی قبائلیوں کے ہاں چلا گیا، چکوال کے قریب ایک ہندو ایس۔ڈی۔او پُراسرار طریقے سے قتل ہو گیا تھا۔ اِس قتل کا الزام سرور پنجابی پر عائد کیا گیا تھا جو اُس وقت قبائلی علاقے میں تھا، چکوال میں نہیں تھا۔ اٹھائیس سال بعد مجھ پر یہ انکشاف ہُوا کہ اس ہندو افسر کا قاتل کوئی اور تھا اور وہ اب جامع مسجد کا خطیب ہے۔ اُس نے اس ہندو کو ذاتی اور اسلامی غیرت کے جوش میں قتل کیا تھا۔

مَیں اُن دنوں ایک ڈائجسٹ پرچے سے منسلک تھا۔ یہ دو کہانیاں شائع کیں تو قارئین کے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ ان کرداروں کے ایڈریس پوچھے گئے جو میں نے انہیں بتائے۔ پھر میں ایسے ہی کرداروں کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ پرچے کے مالکان ترجموں کی گھسی پٹی ڈگر سے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن قارئین اس یورپی ڈگر سے متنفر ہو گئے اور وہ پاکستانی کہانیوں کا مطالبہ کرنے لگے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ مَیں نے اپنے لیے مشکل پیدا کر لی ہے۔ مقامی کہانیوں کی تلاش جان جوکھوں کا کام تھا۔ بہرحال یہ مشکل اس طرح آسان ہو گئی کہ ایک بزرگ کردار سے ملا تو انہوں نے ایک اور کا اَتا پتا بتا دیا۔ اُسے ملا تو اُس نے گھوڑے پر بٹھا کر ایک اور گاؤں کو روانہ کر دیا اور یوں کردار سے کردار اور کہانی سے کہانی نکلتی چلی گئی مگر میرا حشر یہ ہو گیا کہ پوٹھوہار کی دشوار گزار سرزمین پر مجھے بڑا ہی صبر آزما سفر کرنا پڑا جو ابھی تک جاری ہے اور میں اسے جاری ہی رکھوں گا۔ مَیں "حکایت" میں

ایسی بہت سی کہانیاں شائع کر چکا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

اسی جستجو میں صابر حسین راجپوت سے ملاقات ہوئی۔ اُن کا گاؤں شہر سے دُور تو نہیں لیکن کچّے راستے نہ ہونے کی وجہ سے اور علاقہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے اُن کا گاؤں افریقہ جتنا دُور لگتا ہے۔ پہلی ملاقات میں اُن کی عمر ستّر سال کے قریب تھی، اب چھہتّر سال ہے۔ مَیں نے مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا ــــ "..... مگر آپ کو تو آدم خور شیروں کی کہانیوں کی ضرورت ہو گی۔ مَیں تو کُتّوں سے گیدڑوں کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور وہ بھی نصف صدی پہلے کے قصّے ہیں۔ اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ لوگوں کے ذہن بدل گئے ہیں۔ سُنا ہے شہروں میں لوگ انگریزی کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس جاہل علاقے کی اتنی قدیم کہانیاں کون پسند کرے گا؟"

پسند کا یہ عالم تھا کہ پہلی ہی کہانی شائع کی تو میرے قارئین آدم خور شیروں کے شکار کی ترجمہ کہانیاں بھول گئے۔ اُن کے ذہنوں سے جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن جیسے گھسے پٹے نام دُھل گئے۔ گزشتہ سات برسوں میں، مَیں صابر حسین راجپوت کی متعدد کہانیاں شائع کر چکا ہوں۔ قارئین کا ایک ہی مطالبہ ہے "صابر حسین راجپوت کی کہانی"۔ قارئین کی اِس بے تابی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مَیں قارئین کی حق تلفی کرتا رہا ہوں جس سے مصنّف کے سوا کوئی بھی آگاہ نہیں۔ مَیں نے ہر کہانی ادھوری شائع کی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ایک کہانی اس قدر طویل تھی کہ پرچہ اتنی طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مَیں نے دل پر پتھر رکھ کر ہر کہانی

میں سے متعدد واقعات حذف کر دیے تھے۔ قارئین کی بے تابانہ فرمائش سے متاثر ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں ہر ایک کہانی مکمل سنائی جائے۔ یہ صرف کتاب میں ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

لیجئے، آٹھ مکمل کہانیاں حاضر ہیں۔

ان میں سے کئی ایک کہانیاں کئی ایک قارئین نے نہیں پڑھی ہونگی اور جو پڑھی ہیں وہ مکمل نہیں تھیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ ایک نئی چیز ہوگا۔

یہ کہانیاں صرف شکار کی یا صرف صابر حسین راجپوت کے تجربات کی کہانیاں نہیں۔ یہ پوٹھوہار کی مردانگی اور کردار کی ایک فلم ہے جس میں آپ کو وہ جوان ملیں گے جو وطن کے پاسبان ہیں۔ پوٹھوہار وہ علاقہ ہے جس نے تین نشانِ حیدر پیدا کیے ہیں۔ سب سے پہلا نشانِ حیدر کیپٹن سرور شہید پوٹھوہاری تھا۔ اس علاقے کے کسی بھی قبرستان میں چلے جائیے آپ کو ایک چوتھائی قبریں شہیدوں کی نظر آئیں گی۔ سلّوں کی چٹانوں اور مٹی کے ٹیلوں کے اس خطّے نے پاکستان کے وہ رکھوالے پیدا کئے ہیں جو سلّوں کے دل چیر دیتے ہیں لیکن اُن کے اپنے دل مٹی سے زیادہ نرم ہیں۔ پاکستان کی آدھی فوج پوٹھوہاری ہے۔ اس علاقے نے پاکستان کو بہترین کمانڈو اور گوریلا لڑاکے دیئے ہیں۔ یہ اس علاقے کے خدوخال کی خصوصیت ہے۔ صابر حسین راجپوت کی کہانیوں میں آپ کو یہی خصوصیت سرگرمِ عمل نظر آئے گی۔

یہ کہانیاں افسانے نہیں سچی وارداتیں ہیں۔ ان میں آپ کو صرف شکار نہیں حقیقی زندگی کے حیران کُن ڈرامے بھی ملیں گے۔ ان میں آپ کو سچی محبت بھی ملے گی اور اُن پیروں کی کرتوت بھی جن کی "کرامات" نے لوگوں کو پیر پرستی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ صابر حسین راجپوت نے اپنی ایک کہانی "خدا کی قسم میں کنواری ہوں" میں ایک باعصمت دیہاتی لڑکی اور ایک پیر کا واقعہ سُنا کر کرامات اور کرتوت کا فرق واضح کر دیا ہے۔

میں اس مجموعے کی ہر ایک کہانی پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اتنی سی بات ضرور کہوں گا کہ صابر حسین راجپوت نے یہ کہانیاں آپ کی صرف تفریحِ طبع کے لئے نہیں لکھیں۔ ان میں ایک پیغام ہے جو انہوں نے پاکستان کے نوجوانوں کے نام دیا ہے۔ یہ پیغام آپ کو ہر کہانی میں ملے گا۔ یہ پیغام اپنے بچّوں تک پہنچانا آپ کا فرض ہے۔

عنایت اللہ

مدیر مسئول ماہنامہ "حکایت" لاہور

لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

ہمارا ایک دوست غار کے اندر گم ہو گیا۔ گاؤں میں
عورتوں کو لمبے لمبے آدمی نظر آنے لگے۔ دو دوست مارے
گئے۔ ہر طرف ہیبت تھی، دہشت تھی اور ہمیں، اسی
ہیبت، اسی دہشت سے پیار تھا۔

نہیں کہ مجھے شکاری کہلانے کا حق حاصل ہے یا نہیں کیونکہ میں
معلوم نے کبھی شیر نہیں مارا۔ شیر سرکس میں دیکھے ہیں یا دو بار لاہور کے
چڑیا گھر میں۔ میرے پاس دونالی بندوق بھی نہیں ہے نہ کبھی تھی۔ شکار کی کہانیاں
بہت پڑھی ہیں ہر کہانی میں ایک آدم خور شیر لوگوں کو اُٹھائے جاتا ہے۔ جب
بس پندرہ انسان آدم خور کی نذر ہو جاتے ہیں تو لوگ اور افسر کسی شکاری کی
خدمات حاصل کرتے ہیں۔ شکاری بندوق لے کر جاتا ہے۔ شیر کے کھاتے ہوتے لوگوں کے
پسماندگان سے دردناک کہانیاں سنتا ہے۔ ڈاک بنگلے میں رہتا ہے۔ آرام کرتا
ہے۔ کھاتا کھاتا ہے۔ مچان بندھواتا ہے۔ بکرا بندھواتا ہے اور رات کے وقت
شیر بکرے کو کھانے آتا ہے آخر شیر مارا جاتا ہے اور گاؤں والے خوشیاں مناتے
ہیں۔ شکاری اسی کو کہتے ہیں جس نے یہ ڈرامہ کھیلا ہو اور جس نے کبھی بندوق
نہ چلائی ہو کبھی مچان پر نہ بیٹھا ہو ہانکا نہ کرایا ہو، آدم خور کو نہ مارا ہو وہ بھلا کیسا

شکاری؟ ہم تو پہلے غلیل سے چڑیوں کو مارتے رہے۔ جب گاؤں والوں نے
بتایا کہ بیٹا، جوان ہو گئے ہو۔ کہیں نوکری کر لو پھر شادی بیاہ کی فکر کرو تو شکار دھرا
دھرایا رہ گیا۔ ہم کہیں نوکر تو نہ ہوئے البتہ شادی ہو گئی۔ چند دن گزرے تو ایسے
محسوس ہوا جیسے ماں باپ نے ہمیں بکرا بنایا ہے اور ایک آدم خور کو پھانسنے
کے لیے ہمیں باندھ کر خود مچان پر جا بیٹھے ہیں۔

شادی سے پہلے کی بات ہے کہ ہم شکار کھیلا کرتے تھے۔ پہلے تو غلیل بنائی
چڑیاں بھی ماریں، کوّے بھی، فاختہ اور طوطے بھی اور ایک بار تو ایک گدھے کے
سر پر غلیلہ مار کر اُلٹا دیا تھا۔ کئی گھونسلے اجاڑے۔ ننھے ننھے بچوں
کو یتیم کیا۔ انڈے توڑے اور پنکھ پکھیرو کی بددعا جو لگی تو ہم نے اللہ جوائی کے
گھڑے کو نشانہ بنا ڈالا۔ اللہ جوائی گلہ کرنے ہمارے گھر آئی۔ ہماری ماں نے
اسے نیا گھڑا پیش کیا۔ باپ نے معافی مانگی اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ
معافی خلوصِ دل سے مانگی گئی ہے مجھے تین جوتے مارے پھر ایسی ایسی
گالیاں دیں کہ اللہ جوائی گھونگھٹ کی اوٹ سے ہماری ماں کو دیکھ کر "ہیہ ہیہ"
کر کے ہنسنے لگی۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ بڑی دیر ہماری ماں کے
پاس بیٹھی اپنے سُسرال کو کوستی رہی۔ ہمارا قصور معاف ہو گیا۔ ہماری
ماں اور اللہ جوائی کی دوستی پکی ہو گئی۔

ہمارا خیال تھا کہ اللہ جوائی نے ہمیں بخش دیا ہے لیکن وہ ہاتھی اور اونٹ
کی طرح کینہ پرور نکلی۔ وہ اس طرح کہ پانچ سال بعد وہ ہماری ساس بن
گئی۔ ہم سے گھڑا ٹوٹا کہ اپنی قسمت ہی پھوٹ گئی۔ اب پانچ لڑکیاں اور

چار لڑکے ہیں۔ گھر میں وہ ہانکا ہوتا ہے کہ ہم اِس کونے سے بھاگ کر اُس کھدرے میں جا چھپتے ہیں۔ اِس کھدرے سے بھاگ کر اس کونے میں جا پناہ لیتے ہیں۔ باہر آتے ہیں تو بیوی شِست باندھے نظر آتی ہے۔ یہ سب اُن پرندوں کی بددعا کا نتیجہ ہے جنہیں ہم نے غلیلوں سے مارا تھا یا اُن گیدڑوں اور خرگوشوں کی بددعا کی پھٹکار جنہیں ہم نے کتّوں سے مروایا تھا۔

یہ تو خیر خاندانی منصوبہ بندی کا موضوع ہے۔ میں تو شکار کی بات کر رہا تھا۔ دس جماعتیں پاس کیں تو شکار کی ایک کہانی پڑھی جو اتنی اچھی لگی کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی کہانیاں پڑھنے لگے۔ افریقہ میں بندوقوں سے درندوں کے شکار کے علاوہ کتّوں سے شکار کھیلنے کے قصّے بھی پڑھنے میں آئے۔ اپنی طبیعت بچپن سے ہی شکاری تھی۔ بندوق سے شکار کھیلنے کو دل اُچھل اُچھل جاتا تھا لیکن بندوق ہماری دسترس سے بہت ہی دُور تھی۔ غلیل تو تھی لیکن اب عمر ایسی تھی کہ غلیل اٹھاتے شرم آتی تھی۔ جب کتّوں کے شکار کے قصّے پڑھے تو دوستوں سے کہا کہ بھائیو کتّے اکٹھے کرو اور چلو شکار کو چلیں۔ میں نے دوستوں کو برطانیہ کے لارڈوں اور ہندوستان کے نوابوں اور راجوں مہاراجوں کے قصّے سنائے کہ وہ کس طرح گھوڑوں پر سوار ہو کر کتّوں سے ہرن، بارہ سنگھے، شیر اور چیتے شکار کرتے ہیں۔

ہم نے کتّوں کی تلاش شروع کر دی۔ خریدنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہاں کہیں سراغ ملتا تھا کہ کسی کی کتّیا نے پلّے جنے ہیں تو ہم سفارشیں لے کر وہاں جا پہنچتے تھے اور ایک دو پلّے اٹھا لاتے تھے۔ ایک بار بُل ٹیریر

نسل کے دو پلّے چوری بھی کیے تھے جو بڑے ہو کر نہایت خونخوار شکاری نکلے اُن دنوں ہمارے علاقے میں کتّے لڑانے کا بہت رواج تھا اس لئے لوگ لڑنے والے کتّوں کی نسل کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ لہٰذا ہمارے پاس دو شکاری بُل ٹیریر اور پانچ لڑنے والے کُتّے آ گئے جنہیں ہم خونِ جگر سے پالنے لگے۔ ان ہی دنوں ہمارے ہاں ایک امیر کبیر زمیندار فوت ہو گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے، ارشد اور افضل۔ دونوں نوجوان اور دونوں ہماری منڈلی کے سرگرم ہمجولی۔ بے شمار زمین کے علاوہ باپ ان کے لیے بہت سا نقد روپیہ چھوڑ مرا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اس نقدی کو اجاڑنا شروع کر دیا۔ یہ مجھے آج محسوس ہو رہا ہے کہ انہوں نے باپ کی دولت کے ساتھ ناانصافی کی تھی مگر اُس وقت ہم نے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی تھی۔ اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے شراب تو دُور کی بات ہے سگریٹ تک کو منہ نہ لگایا۔ شہر میں جا کر سینما نہ دیکھا اور دولت کے نشے میں گردن اونچی کر کے دوسروں کو حقیر نہ جانا۔ دو دوست ایسے تھے جو عیاشی کو فحاشی میں بدلنا چاہتے تھے لیکن انہیں اپنی محفل سے نکال دیا گیا تھا۔ انہوں نے ایک روز مشورہ دیا تھا کہ جہلم سے ناچنے گانے والی ایک دو طوائفوں کو لایا جائے اور گاؤں میں جشن منایا جائے۔ دونوں بھائی، ارشد اور افضل جہلم گئے اور وہاں سے ایک ہارمونیم، ایک ڈھولکی اور گھنگھرو لے آئے۔ انہوں نے یہ ساز بیٹھک میں رکھ کر ایک میراثی ملازم رکھ لیا اور دوستوں سے کہا کہ جسے گانے کا شوق ہے وہ گائے اور جسے بجانے کا شوق ہے وہ

میراثی سے ہارمونیم سیکھ لے اور جو ناچنے کا دلدادہ ہے وہ گھنگھرو باندھ کے ناچ کرے۔ کوئی تین ماہ بعد ہم میں سے دو لڑکے ناچ کے ماہر ہو گئے۔ دو تین ہارمونیم میں تاک اور تقریباً سبھی گانے لگے۔ گاؤں والوں کو یہ فائدہ ہوا کہ بیاہ شادی پر کسی کو باہر سے قوال نہیں بلانے پڑتے تھے ہم فی سبیل اللہ سب کی خدمت کرتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب دیہات میں ابھی بجلی نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے وہاں ریڈیو بھی نہیں پہنچے تھے، اور ٹرانسسٹر ابھی ایجاد نہیں ہوتے تھے اور اسی لیے دیہات فلمی گانوں سے بھی محفوظ تھے۔ ہم صاف ستھرے گانے گایا کرتے تھے۔ مگر دو حادثے ایسے ہو گئے کہ ہم نے گانے بجانے کا سلسلہ ہی توڑ ڈالا۔ ہوا یوں کہ ہمارا ایک دوست خوبرو بھی تھا اور خوش گلو بھی۔ رات کے وقت جب وہ گاؤں کی کھلی فضا میں گاتا تھا تو گاؤں پر سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ ایک روز اُس نے مجھے رازداری سے بتایا کہ فلاں گھر کی لڑکی نے اسے راہ میں روک کر دلربانہ وار اظہارِ محبت کیا ہے۔ میرا یہ دوست خاصا پریشان تھا کیونکہ گاؤں میں عشق و محبت کو ہم سب گناہ سمجھتے تھے۔ پھر بھی ان کی محبت چوری چھپے پروان چڑھنے لگی۔ مگر لڑکی کو کسی اور کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ شادی کے تیسرے ہی مہینے لڑکی پاگل ہو گئی۔ وہ کھیتوں میں نکل جاتی تھی اور بلند آواز سے گاتی پھرتی تھی ؎

دن چڑھیا تے بانکیاں ناراں تڑیاں کھوہ ول بن قطاراں
اُڈ گئے پنچھی مار اُڈاراں

یہ گانا میرا دوست اکثر گایا کرتا تھا۔ آخر ایک رات وہ گھر سے غائب ہو گئی اور تیسرے دن اس کی لاش گاؤں سے دو میل دُور ایک کھڈ سے ملی۔ اس کی لاش جگہ جگہ سے کھائی اور نوچی ہوئی تھی۔

دوسرا حادثہ زیادہ افسوسناک تھا۔ ایک اور لڑکی ہمارے ایک دوست کو محبت کے پیغام بھیجنے لگی۔ یہ دوست بھی پریشان ہو گیا۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو ہم نوجوان سکی بہنیں اور گاؤں کی عزت سمجھا کرتے تھے۔ یہاں میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ محبت فلمی قسم کی نہیں تھی بلکہ اس میں پاکیزگی تھی۔ ہمارا دوست ٹالتا رہا۔ آخر ایک رات لڑکی نے عجیب حرکت کی۔ وہ ہاتھ میں قرآن اٹھائے ہمارے دوست کے گھر چلی گئی اور اسے کہا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں بدکار ہوں۔ لو درمیان میں قرآن رکھ دیتی ہوں۔ اپنے ماں باپ سے کہو کہ میرے رشتے کے لیے میرے ماں باپ کے پاس جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو مجھے اپنے ساتھ کہیں لے چلو جہاں ہم شادی کر لیں۔ اتنی دیر میں لڑکی کے دو بھائی اور اس کا باپ لڑکی کو ڈھونڈتے وہاں جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈانگ سوٹا چلا۔ لڑکی کا بھائی قتل ہو گیا۔ ہمارا دوست زخمی اور اس کے بڑے بھائی کو عمر قید ہو گئی اور یہ عداوت ابھی تک چل رہی ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کا خون بہاتے اور عدالتوں میں پیشیاں بھگتتے رہتے ہیں۔

اس دوسرے حادثے کے بعد ارشد اور افضل نے ہارمونیم، ڈھولکی اور گھنگھروؤں کو کوڑے کباڑ کے کمرے میں پھینک دیا۔ ہم چھ سات دوست ایک کتا پال رہے تھے۔ ارشد اور افضل کو بھی شکار کا شوق چرایا تو انہوں نے لوگوں

سے شکاری نسل کے پلّے مانگنے کی بجائے شکاری کتّے قیمتاً خریدنے کی مہم شروع کر دی۔ ان کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کا ایک چچا کوہاٹ فرنٹیئر میں ملازم تھا۔ اس نے کوہاٹ سے انہیں دو کتّے بھیجے۔ دونوں بُوگیر تھے۔ بہت تیز بھاگتے تھے لیکن دونوں بالکل بہرے تھے۔ لطیف سی آہٹ بھی نہیں سُن سکتے تھے۔ ایک تازی نسل کا کُتّا سرگودھے سے آگیا۔ تازی لمبی لمبی ٹانگوں والا کُتّا ہوتا ہے۔ جسم اس قدر دُبلا کہ پسلیاں آسانی سے گنی جا سکتی ہیں۔ دوڑ میں کسی نسل کا کُتّا اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ہرن تک کو جا لیتا ہے۔ اس کی رفتار کی وجہ سے ہمارے علاقے میں اسے جہازی کُتّا بھی کہا کرتے ہیں۔ شکار میں تازی کتّے کا ساتھ ہونا اس لیے لازمی سمجھا جاتا ہے کہ یہ دوسرے کُتّوں سے بہت پہلے شکار سے جا اُلجھتا ہے۔ وہ صرف دوڑ سکتا ہے، درندے کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اسے بھاگنے نہیں دیتا اور پھرتیلا ہونے کی وجہ سے اس کے وار کی زد میں بھی نہیں آتا۔ اتنی دیر میں خونخوار نسلوں کے کتّے پہنچ جاتے ہیں اور چند منٹوں بعد شکار کی بوٹی بھی نہیں ملتی۔

تین چار مہینوں تک ارشد اور افضل کے ہاں کم و بیش دس کتّے جمع ہو گئے جن کے لیے انہوں نے ایک مکان الگ کر دیا اور دو نوکر رکھ لیے۔ جب ہمارے چھ سات کتّے بھی بڑے ہو گئے تو ہم نے انہیں ارشد اور افضل کے کتّوں کی جماعت میں شامل کر دیا — اب شکار کے پروگرام بننے لگے۔ ہم برطانیہ کے لارڈ یا ہندوستان کے نواب اور مہاراجے تو نہیں تھے کہ گھوڑے بھی خرید لیتے۔ ہمیں کُتّوں کے ساتھ شکار کے پیچھے اپنے پاؤں پر بھاگنا تھا۔ ہم میں سے کسی

کو بھی کُتّوں کے شکار کے متعلق ذرّہ بھر سوجھ بوجھ نہیں تھی نہ یہ علم تھا کہ کُتّوں کو ایک ٹیم کی صورت میں کس طرح ٹریننگ دی جاتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارا علاقہ کس قدر دشوار گذار اور کتنا اوٹ پٹانگ ہے۔ میں شکار کی پہلی اور سب سے بڑی مشکل کا ذکر کر دوں۔ ہمیں چونکہ کتّوں کو ٹریننگ دینے کا علم ہی نہیں تھا اس لیے ہم دس بارہ لڑکے دس بارہ کتّوں کو ساتھ لیے شکار کو نکل گئے۔ اچانک ایک جھاڑی سے ایک خرگوش نکلا اور ہوا ہو گیا۔ تمام کتّے اس کے پیچھے بھاگے اور اُن کے پیچھے ہم بھاگے۔ تازی کتّے نے دو تین سو گز کا فاصلہ گولی کی طرح طے کیا اور خرگوش کو منہ میں اٹھا کر جھنجھوڑنے لگا۔ کوہاٹ کے دو بہرے کتّے پہنچ گئے۔ ایک نے خرگوش کو منہ میں لے لیا اور دوسرا تازی کتّے پر ٹوٹ پڑا۔ اتنے میں آٹھ اور کتّے پہنچ گئے۔ ان میں ایک لڑاکا اور بڑا ہی خونخوار کُتّا تھا۔ اس نے اس کتّے کی گردن کو منہ میں لے لیا جس کے منہ میں خرگوش تھا۔ خرگوش تو الگ جا پڑا لیکن کُتّا تڑپنے اور خراٹے لینے لگا۔ خرگوش ایک اور کتّے کے منہ میں آگیا اور اس کتّے پر دو کتّے ٹوٹ پڑے۔ تھوڑی دیر بعد خرگوش کا تو نام و نشان نہ رہا لیکن کُتّوں کا یہ عالم کہ ایک دوسرے کو لہولہان کر رہے تھے۔ ہم کبھی ایک کو پچھلی ٹانگوں سے گھسیٹتے کبھی دوسرے کے سر پر تھپڑ مارتے۔ سب سے زیادہ مظلوم تازی کُتّا تھا۔ وہ لڑ تو نہیں سکتا تھا کیونکہ لڑنا اس کا شیوہ نہیں، وہ دُم کو پچھلی ٹانگوں میں دبا کر ہماری ٹانگوں میں پناہ لے رہا تھا۔ ایسا قیامت خیز معرکہ تھا کہ کُتّوں کے بھونکنے، غرّانے اور اُن کی خونخوار آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ہمارے

لیے فائر بندی کرانا ناممکن ہوگیا۔ ارشد کتوں کو چھڑاتے ہوئے گر پڑا اور دو کتے اس کی پیٹھ پر لڑنے لگے۔ آخر ہم نے دور کھڑے ہو کر ان پر مٹی کے ڈھیلوں کی بارش برسا دی۔

کتوں کو ہم کھلا لے گئے تھے۔ کوئی ایک بھی زنجیر نہیں تھی۔ بعض لڑکوں نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ انہوں نے پگڑیوں سے رسّوں کا کام لیا اور ایک ایک کتے پر قابو پایا۔ تین کتے ابھی تک بے قابو تھے اور پگڑی کوئی نہیں تھی۔ میں نے ارشد اور افضل نے اپنی اپنی شلواریں اتاریں، ان کے ازار بند نکالے اور تین کتوں کے پٹوں سے ازار بند باندھ کر انہیں قابو کیا۔ شلواریں کندھوں پہ ڈالیں اور گاؤں کو چل دیئے۔ گاؤں قریب آیا تو کتوں کو کھلا چھوڑ کر ازار بند شلواروں میں ڈال لیے اور شلواریں پہن کر گاؤں میں داخل ہوئے۔ تقریباً سبھی کتے زخمی تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر غصّے سے غرّا رہے تھے۔ ان کے آپس کے تعلقات کشیدہ ہو جانے کی وجہ سے ہماری شکاری مہمیں رُک گئیں اور ہم سوچنے لگے کہ انہیں صلح صفائی سے شکار کھیلنے کی ٹریننگ کس طرح دی جائے۔

ہمارا علاقہ میدانی نہیں ہے۔ جہلم سے راولپنڈی کی طرف جاؤ تو اونچے اونچے پہاڑوں سے نکل کر سوہاوہ کا گاؤں آتا ہے۔ یہاں سے راولپنڈی تک اور سکیسر کی پہاڑیوں سے کشمیر کی سرحد تک کا علاقہ پتھروں کی چٹانوں، مٹی کے ٹیلوں اور گہرے کھڈ نالوں کا علاقہ ہے۔ کھیت اونچے نیچے ہیں۔ بعض جگہوں پر اونچے نیچے کھیتوں کا سلسلہ پانچ سات سو گز دور تک چلا جاتا ہے۔ آخر میں

آپ گھبرا کر رُک جاتے ہیں کیونکہ میدان یک لخت ختم ہو گیا ہے اور آپ دو اڑھائی سو فٹ بلند ٹیلے یا عمودی دیوار پر کھڑے ہیں۔ نیچے دیکھئے یا تو کوئی خشک نالے کا پاٹ ہوگا یا کھیتوں کا ایک اور سلسلہ یا محض کھڈ اور کھائیاں۔ جا بجا مٹی کی دیواریں کھڑی نظر آتی ہیں جن کے اوپر چڑھ جاؤ تو تھوڑی دُور تک کھیت نظر آئیں گے۔ آگے پھر وسیع کھائیاں اور کھڈ۔ خشک ندی نالے بے شمار ہیں جن میں برسات میں پانی بہتا ہے اور برسات گزر جانے کے بعد وہاں ریت ہی ریت رہ جاتی ہے۔ جھاڑیاں عام ہیں اور درختوں کی کہیں تو اتنی بہتات ہے کہ جُھنڈ نظر آتے ہیں اور کہیں دُور دُور تک کوئی پیڑ نظر نہیں آتا۔ ان خدوخال نے ایسی دشواری پیدا کر رکھی ہے کہ پکی سڑکیں نہیں بنائی جا سکتیں۔ ابھی تک باربرداری کے لیے اونٹ اور گدھے استعمال ہوتے ہیں اور لوگ طویل مسافت پیدل طے کرتے ہیں۔

اس علاقے میں جو دلچسپ اور عجیب چیز دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ برساتی پانی کے زمین دوز راستے ہیں۔ برسات میں بہت بارش ہوتی ہے۔ اونچے نیچے کھیتوں کا پانی سیلاب کی صورت اختیار کر کے اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ کسی نشیبی کھیت میں جنگلی چوہوں نے جن میں سے بعض بلّی جتنے بڑے بھی ہوتے ہیں، بڑے بڑے بل بنائے ہوتے ہیں۔ سیلابی پانی ان بلوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ چوہوں کے بل زمین کے اندر دُور تک گئے ہوئے ہوتے ہیں جہاں بل ختم ہوتے ہیں اور زمین خاصی نرم ہوتی ہے۔ وہاں اُوپر سے پانی بڑے زور سے بلوں میں داخل ہوتا ہے اور چوہوں کی دنیا سے گزرتا ہوا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔

اور دُور کہیں کسی ٹیلے کے دامن سے جا باہر نکلتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اوپر سے کھیت صحیح سلامت اور قابلِ کاشت رہتا ہے۔ جہاں سے پانی باہر نکلتا ہے وہاں برسات کے بعد غار کا منہ بن جاتا ہے۔ بعض کھیت دھنس جاتے ہیں اور وہاں کھڈ بن جاتے ہیں۔ اوپر جس کھیت سے پانی اندر داخل ہوتا ہے وہاں کا منظر زیادہ حیران کُن ہوتا ہے۔ پیچھے سے سیلاب چلا آرہا ہے اور ایک جگہ غائب ہوتا نظر آتا ہے۔ برسات کے فوراً بعد تمام پانی خارج ہو جاتا ہے اور ایک آدھ مہینے بعد کیا اندر کیا باہر زمین خشک ہو جاتی ہے۔

جہاں سے پانی باہر آتا ہے وہاں غار کا دہانہ بن جاتا ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ تو اندر کئی ایک کشادہ راستے نظر آتے ہیں۔ اُن کی چھتیں بلند ہوتی ہیں۔ بعض جگہوں پر جُھک کر چلنا پڑتا ہے۔ آگے چلے جاؤ تو راستے بھول بھلیاں بن جاتے ہیں۔ گپ اندھیرا ہوتا ہے اور دم گھٹتا ہے۔ برسات کے بعد ان غاروں کے اندر گیدڑ، اُود بلاؤ، سیہہ، گوہ اور زہریلے سانپ آن آباد ہوتے ہیں۔ وہ اندر اپنے اپنے گھر بنا لیتے ہیں۔ ایسی ہی غاروں اور زمین دوز بھول بھلیوں میں خرگوش بھی رہتے ہیں۔ یہی جانور ہمارا شکار ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھار ایک دو بھیڑیئے یا لومڑی بھی سامنے آجاتی تھی۔ ان درندوں کو غاروں سے باہر نکالنے کے لیے ہم کوئی بکرا انہیں باندھا کرتے تھے نہ کوئی مچان بنتی تھی۔ ہم خود بکرے بنتے تھے اور شکار کو باہر نکالنے کے لیے کسی بھیڑیئے کی کچھار یا کسی سانپ کے بل پر جا پاؤں رکھتے تھے۔

پہلے شکار پر کتوں کے تعلقات بگڑ گئے تھے جس سے ہمارے سامنے

یہ مسئلہ آن کھڑا ہوا تھا کہ انہیں آپس میں نہ لڑنے کی تربیت کس طرح دی جائے۔ ایک بزرگ نے بتایا کہ کتوں کو کسی ایک جانور کے پیچھے بھگاؤ اور ہاتھوں میں ڈنڈے یا ہینٹر لے کر کتوں کے ساتھ رہو۔ جو کتا دوسرے پر حملہ کرے اُسے مارو اور اس کی توجہ شکار کی طرف کرو۔ ظاہر ہے کہ ہم خرگوش کے پیچھے بھاگتے کتوں کا ساتھ پاپیادہ تو نہیں دے سکتے تھے۔ آخر گول میز کانفرنس کے بعد ہمیں ایک ایسا جانور نظر آگیا جس کے ساتھ ہم دوڑ سکتے تھے۔ یہ تھا گدھا۔ ویران کھیتوں میں اِدھر اُدھر کے گاؤں کے گدھے اکثر چرتے چُگتے رہتے تھے۔ ہم نے ایک روز ایک گدھے کو پکڑا اور اسے گاؤں والوں کی نظروں سے دُور کھڈ نالوں کے علاقے میں لے گئے۔ ہمارے ساتھ تمام کتے تھے اور ہمارے ہاتھوں میں باریک بید اور رسیوں کے ہینٹر۔ ہم نے کتوں کو گدھے کے پیچھے چھوڑا تو گدھا سرپٹ بھاگا لیکن کتے اسے کہاں جانے دیتے؟ چند قدموں پر اسے کتوں نے گھیر لیا اور اس پر پل پڑے۔ ہر کتا اسے اپنا شکار سمجھ کر دوسرے کتوں سے اُلجھتا تھا اور ہم بزرگ کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کر رہے تھے۔ ہم نے آپس میں لڑنے والے کتوں کو خوب پیٹا اور ان کی توجہ "شکار" پر مرکوز کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھا کہ گدھا بھی زخمی نہ ہو ورنہ گاؤں میں ہمارا جینا محال ہو جاتا۔

یہ کام سہل نہ تھا۔ ہم سب شکاری آدھے گھنٹے میں پسینے میں شرابور اور آدھ موئے ہو گئے۔ مگر یہ یقین نہ آیا کہ یہ ترکیب کامیاب ہے۔ ہم نے ہمت و استقلال کا دامن نہ چھوڑا اور ہر روز ایک گدھے کو دُور لے جا کر کتوں کی ٹریننگ

کرنے لگے۔ ایک روز ایک گدھے نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ وہ اس طرح کہ اس گدھے نے کتوں سے ڈرنے کی بجائے ایک کتے کے ایسی دولتی ماری کہ وہ قلابازیاں کھاتا دُور جا پڑا۔ فوراً بعد ایک اور کتے کے منہ پر دولتی پڑی۔ یہ دونو کتے انتہائی غصّے کے عالم میں گدھے پر حملہ آور ہوئے تو گدھے نے گھوم کر ایک ایک دولتی اور جھاڑ دی۔ اس طرح چار پانچ کتوں کو دولتیاں پڑیں۔ ان کا ہر انتقامی حملہ ناکام ہونے لگا تو کتے ایک دوسرے کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے پھر مل کر گدھے پر حملہ کرنے لگے۔ اب کتوں کا درد مشترک تھا اور دشمن بھی مشترک، ہم نے دیکھا کہ انہوں نے ایک دوسرے سے لڑنا ترک کر دیا اور گدھے سے انتقام لینے کے لیے ایک ہو گئے۔

ہم کتوں کی نفسیات سمجھ گئے اور ہر روز اسی گدھے کی خدمات حاصل کرنے لگے۔ کتوں کو تو ہم نے گدھے کی دولتیوں سے لہولہان کرا لیا لیکن ان کے باہمی اختلافات ختم ہو گئے۔ وہ جونہی اس گدھے کو دیکھتے، نہایت خوش اسلوبی سے اسے گھیرے میں لے لیتے اور ذرا سی دیر میں اسے گرا دیتے۔ گو ہمارے لیے یہ مشکل پیدا ہو جاتی کہ گدھے کو اُن سے صحیح سلامت چھڑا لیا جائے۔

جب سب کتے ایک ٹیم کی صورت میں تیار ہو گئے تو ایک روز ہم شکار کو نکلے۔ ہر کوئی اپنے اپنے گھر سے دو دو روٹیاں، اچار یا انڈے یا ساگ ساتھ لے آیا۔ پانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمارے علاقے میں کہیں بھی نکل جاؤ پیاسا مرنے کا خطرہ بالکل نہیں ہوتا۔ ہم دُور ویرانے میں نکل گئے۔ مٹی کے ٹیلوں اور کھڈ نالوں کے علاقے میں مُشک لینے والے دو کتے بے تابی سے

زمین کو سونگھتے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور باقی تمام کتوں کو ہم نے زنجیروں سے باندھ رکھا تھا۔ صرف تازی کتا مشک لینے والے کتوں کے ساتھ آزادی سے گھوم رہا تھا۔ ہم ساڑھے چار میل دُور نکل گئے۔ نہ کوئی خرگوش دکھائی دیا نہ گیدڑ۔ تھوڑی دُور سے ہمیں ایک بوگیر کتے کی ایسی دلدوز چیخ سنائی دی کہ ہم ایک بار تو دہل گئے۔ معاً بعد دوسرا کتا درد سے بلبلا کر چیخا اور دونوں کتے بہت تیز بھاگتے ہم تک پہنچے۔ وہ بُری طرح چیخ رہے تھے۔ دونوں کتوں کے نتھنوں سے لے کر گردن سے ذرا پیچھے تک ایک ایک لکیر نظر آئی اور دونوں کے نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کتوں کو کسی نے یا تو بڑی زور سے بید مارے تھے یا چمڑے کے ہنٹر۔ دونوں کتے غصّے کے عالم میں پھر اُدھر کو بھاگے مگر رُک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ وہ یقیناً اپنے ساتھی کتوں کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

ہم نے تمام کتوں کے پٹوں (کالروں) سے زنجیریں کھول دیں اور چودہ کتے طوفان کی طرح اپنے مجروح اور مظلوم ساتھیوں کی مدد کو جا پہنچے۔ ہم دس بارہ شکاری بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ کتے ایک کھڈ میں اتر گئے لیکن دو کتے چیختے چلاتے کھڈ سے نکل آئے اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ کھڈ کے اندر سے کئی اور کتوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم پہنچے تو دیکھا کہ وہاں ایک گوہ تھی، دُم سے ناک تک کم و بیش تین گز لمبی تھی۔ ایک گز لمبی تو اس کی صرف دُم تھی۔

گوہ چھپکلی کی شکل کا جانور ہوتا ہے۔ منہ چھپکلی کی طرح چوڑا نہیں بلکہ لمبا اور نتھنے نوک دار ہوتے ہیں۔ ٹانگیں اور دُم بالکل چھپکلی کی طرح۔ لیکن یہ جانور ایک گز سے چار گز تک لمبا ہوتا ہے۔ اس کے پنجے درندوں کی طرح تیز اور کھال بہت

سخت ہوتی ہے۔ وہ اپنا دفاع دُم سے کرتی ہے۔ اس کی دُم آخر میں جا کر باریک ہو جاتی ہے جس پر چھوٹے چھوٹے کانٹے ہوتے ہیں۔ اس کے پنجوں کی گرفت اور گرفت کی مضبوطی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ کسی وقت ڈاکو زندہ گوہ کو کمند کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ گوہ کی کمر کے گرد مضبوط رسّہ باندھ کر اُسے مکان کی چھت پر پھینک دیا جاتا تھا اور نیچے سے رسّہ کھینچا جاتا تھا۔ گوہ چھت پر پنجے گاڑ دیا کرتی تھی اور ڈاکو رسّے کی مدد سے ایک ایک کر کے چھت پر چڑھ جایا کرتے تھے۔ گویا ایک ہٹّے کٹّے آدمی کے بوجھ سے بھی گوہ کے پنجوں کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی تھی۔ گوہ کو پالنا اور سدھانا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ صرف بچّے کو پالا جا سکتا ہے۔

جس کھڈ میں ہمارے کتّے اُتر گئے تھے وہاں کا منظر خوف ناک بھی تھا اور دردناک بھی۔ دو کتّوں کے نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کھڈ خاصا وسیع تھا۔ درمیان میں تین گز لمبی اکیلی گوہ چودہ کتّوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ابھی تک کوئی کتّا اسے چھُو بھی نہیں سکا تھا اور ذرا سی دیر میں اس نے پانچ کتّوں کو لہولہان کر دیا تھا۔ جب وہ دُم کو گھماتی تو آندھی کی چیخوں کی طرح آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر شڑاپ کی آواز اور ایک کتّا تڑپنے لگتا تھا۔ کوہاٹ کے ایک بُل ٹیریر نے پھرتی دکھائی۔ اس نے گوہ کا پورا منہ اپنے منہ میں لے لیا۔ ہم نے فتح کا نعرہ لگایا لیکن گوہ نے ایک پنجہ کتّے کی آنکھ میں اور دوسرا دوسری آنکھ میں ڈالا اور ایک سیکنڈ میں ہمارے اتنے خوبصورت بُل ٹیریر کی دونوں آنکھوں کے ڈھیلے باہر پڑے تھے اور گوہ نے آنکھوں سے لے کر جبڑوں کے نیچے تک کی کھال اور

گوشت ادھیڑ ڈالا۔ کتّے کے جبڑوں کی ہڈیاں صاف نظر آنے لگیں۔ کتّے کا واویلا بڑا ہی ہولناک تھا۔ اس نے منہ کھول دیا لیکن گوہ نے اس کی زبان کو اپنے تیکھے دانتوں میں جکڑ رکھا تھا۔ کتّا تڑپنے لگا مگر گوہ اس کی زبان کو چھوڑ نہیں رہی تھی۔ اس دوران گوہ کی دُم "شوں، شڑاپ" کرتی تیزی سے متحرک رہی اور دوسرے کتّے آگے بڑھ بڑھ کر دُم سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹ رہے تھے۔

بُل ٹیریر کا انجام بہت دردناک تھا۔ اس کے منہ کے اندر اور باہر اب خون ہی خون تھا۔ ہم میں سے کسی نے بڑے غصّے میں کہا — "کتّوں کو مت مرواؤ۔ ہٹا لو کتّے" — اور ہمارا ایک دوست، جابر خان، آگے بڑھا۔ اس نے ایک کتّے کے کالر میں زنجیر ڈالنا چاہی تو کتّا بے قابو ہو کر اِدھر اُدھر بھاگا۔ ایک اور کتّا تیزی سے جابر کی ٹانگوں میں آن اُلجھا اور جابر ایسا گرا کہ گوہ کے قریب جا پڑا۔ گوہ کی دُم کا خوفناک زناٹا سنائی دیا اور جابر تڑپ کر دوہرا ہو گیا۔ وہ ذرا سیدھا ہُوا ہی تھا کہ دوسرا زناٹا سنائی دیا جو جابر کی پسلیوں پر پڑا۔ ہم نے بھاگ کر اسے کُہنیوں سے پکڑا اور گھسیٹ لیا۔ پھر اسے اُٹھا کر کھڈ سے باہر لائے۔ اس کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں، رنگ لاش کی طرح زرد اور سانس اس طرح رُک رہی تھی جیسے ابھی ہمیشہ کے لیے رُک جائے گی۔ دُم کی دونوں ضربیں اس کے سینے پر پڑی تھیں اور سینے پر سیاہ کالے رنگ کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

کتّے ہار گئے تھے اور بُل ٹیریر زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اور اس کی زبان گوہ کے بے رحم منہ میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہم زنجیریں لے کر آگے ہوئے اور بڑی مشکل سے کتّوں کو زنجیریں ڈالیں۔ جابر بے ہوش ہو چکا تھا۔ دو لڑکوں نے

اُسے اٹھایا اور گاؤں کو چل پڑے۔ ہم سب نے بڑے بڑے پتھر جمع کیے اور گوہ پر برسانے لگے لیکن اس کی کھال اس قدر سخت تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار گوہ جانے کس طرح الٹ گئی اور اس کا پیٹ سامنے آگیا۔ بیک وقت دو پتھر اس کے پیٹ پر پڑے تو اس کا پیٹ پھٹ گیا اور اس نے کتے کی زبان چھوڑ دی۔ پھر ہم نے گوہ کو سیدھا نہ ہونے دیا۔ ہمارا بُل ٹیریر خون بہہ جانے کی وجہ سے بے حس پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے ان لڑکوں تک پہنچے جو جابر کو اٹھائے گاؤں کو جا رہے تھے۔ جابر کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ہم نے دیکھا کہ اس کا سینہ سُوج گیا تھا۔ ہم نے اسے باری باری اٹھایا اور ساڑھے چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے گاؤں پہنچے۔ دیہات میں دُور دُور تک کسی ڈاکٹر کا نام و نشان نہ تھا۔ ویسے ہر گاؤں میں ایک حکیم یا "سیانا" ضرور ہوتا تھا۔ ہمارے گاؤں کے "سیانے" نے مرہم پٹی کی مگر رات بھر جابر بے ہوش رہا۔ صبح کے وقت گاؤں کے بزرگوں نے زور دیا کہ اس کی چارپائی اٹھاؤ اور قصبے کے سرکاری ہسپتال لے جاؤ۔ قصبہ پانچ میل دُور تھا۔ ہم سب دوستوں نے جابر کی چارپائی اٹھائی اور لمبی مسافت پر پاپیادہ روانہ ہوئے مگر نصف راستہ طے ہوا تھا کہ جابر بڑی ہی لمبی مسافت طے کر کے آخری منزل پر جا پہنچا۔ اس کا باپ، ایک بھائی، ماں اور اس کی ایک شادی شدہ بہن ساتھ تھی۔ ہم وہیں سے چارپائی اٹھائے گاؤں کو لوٹ آئے۔ نصف صدی گزر گئی ہے لیکن جابر کی ماں اور بہن کے بَین اور جگر خراش فریادیں ابھی تک میرے ذہن میں گونج رہی ہیں۔

اس کے مرنے کے بعد پہلی جمعرات کی رات لوگوں نے جابر کی قبر پر دیا جلتا دیکھا تو سب حیران رہ گئے کیونکہ دیا گھر والوں نے نہیں جلایا تھا۔ دوسرے دن دوپہر تک دیا جلتا رہا پھر تیل ختم ہونے کی وجہ سے بجھ گیا۔ کسی نے دیا نہ اٹھایا۔ اگلی جمعرات دیا پھر جل رہا تھا۔ مرحوم کے ماں باپ اور لواحقین قسمیں کھاتے تھے کہ دیا انہوں نے نہیں جلایا۔ دیہات میں توہم پرستی کا خاصا دخل ہوتا ہے۔ لوگ اسے شہر شرار اور کسی غیبی قوت کا کرشمہ سمجھنے لگے۔ کوئی بھی جرأت نہیں کرتا تھا کہ جمعرات کی رات قبرستان میں جا کر چوری چھپے دیکھ لے کہ دیا کون جلاتا ہے۔ آخر ایک جمعرات ارشد، افضل اور میں شام کے بعد قبرستان میں جا چھپے۔ دو اڑھائی گھنٹوں بعد ہم نے ایک عورت کو جابر کی قبر تک جاتے دیکھا جس نے قبر کے قریب بیٹھ کر دیا سلائی جلائی اور دیا جلا دیا۔ ہم نے دیئے کی روشنی میں اچھی طرح پہچان لیا، وہ جابر کی منگیتر تھی اور رشتے میں وہ اس کی چچازاد بھی تھی۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک قبر پر ہاتھ پھیرتی رہی اور آنسو پونچھتی رہی۔ پھر چلی گئی۔ ہم تینوں دوستوں نے اس بات کو راز ہی رکھا۔ اس نے چار جمعرات دیا جلایا تھا۔ دو سال بعد اس لڑکی کی شادی دوسرے گاؤں میں ہو گئی اور شادی کے تین سال بعد اس کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ ماں نے بچے کا نام جابر رکھا۔ گاؤں میں چند دن کھسر پھسر ہوتی تھی کیوں کہ دیہاتی ماحول میں کوئی لڑکی مرے ہوئے منگیتر کی محبت کا اظہار اس طرح نہیں کر سکتی لیکن بچے کا نام جابر ہی رہا۔

عجیب و غریب اتفاق دیکھئے کہ یہ جابر ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ میں چونڈہ کے

میدان میں لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ جب اس کی لاش گاؤں میں آئی تو سب نے دیکھا کہ دو گولیاں اس کے سینے کی کھال کو چیرتی گزر گئی تھیں۔ ایک پہلو سے دوسرے پہلو تک — کچھ گولیاں اس کے ایک پہلو میں داخل ہو کر دوسرے پہلو سے گزر گئی تھیں۔ یہ دشمن کی مشین گن کا برسٹ تھا۔ جابر کے سینے پر گولیوں کو دیکھ کر اس کی ماں نے کہا تھا: "اُس جابر کے سینے پر بھی ایسی ہی دو لکیریں تھیں۔"

اور وہ جابر جو ہمارا دوست تھا، پچاس سال، گزرے ہمارے ہاتھوں میں مر گیا تو گاؤں کے لوگ ہم شکاری نوجوانوں کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ بعض نے ہمیں گالیاں بھی دیں۔ درحقیقت ہم خود اپنے آپ کو کوس رہے تھے کیونکہ یہ حادثہ ہمارے شکار کے خبط کا نتیجہ تھا۔ ہم نے شکار سے توبہ کر لی۔ جابر کی رسم قل تھی۔ سارے ہی گاؤں کے مرد جمع تھے۔ ہم تمام شکاری بھی موجود تھے کہ کسی نے ہمیں پھر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ ہم مجرموں کی طرح سر جھکا کر چپ بیٹھے رہے۔ آخر دو بوڑھے ہماری حمایت میں بولے۔ یہ دونوں پہلی جنگِ عظیم میں رسالے میں تھے اور فرانس کے محاذ پر لڑے تھے۔ یہ اُس مشہور اور تاریخی مسلمان رسالے کے سوار تھے جس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بوڑھے نے گاؤں والوں کو ڈانٹ دیا اور طنزیہ لہجے میں کہا کہ ان لڑکوں کے ہاتھوں پر مہندی لگا دو۔ ان کے سروں پر دوپٹے رکھو اور انہیں چوڑیاں پہنا کر گھر بٹھا لو۔ دوسرے بوڑھے نے کہا کہ لڑکوں کو بھاگنے دوڑنے دو۔ انہیں موت سے نہ ڈراؤ۔ ہم کل پرسوں مر جائیں گے تو گاؤں کی عزت کو کون سنبھالے گا؟ دونوں بڈھوں نے ہم سے

کہا کہ کسی سے نہ ڈرو، شکار کھیلو، کبڈی کھیلو، کشتی لڑو اور زخمی ہونا سیکھو۔ میرے تایا جان نے تائید میں پہل کی اور کہا کہ اگر میرا بھتیجا شکار یا کبڈی کھیلتے مر گیا تو روؤں گا نہیں۔ اس طرح تائید میں کئی اور آوازیں اٹھیں اور ہم اگلے شکار کی سکیمیں بنانے لگے۔

کتوں کا یہ حال تھا کہ ایک تو مر ہی گیا تھا اور چھ کتے اتنے زخمی تھے کہ پانی بھی نہیں پی سکتے تھے۔ ان کی تھوتھنیاں سوج گئی تھیں۔ گوہ نے ان کا بُرا حال کر دیا تھا۔ اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کتوں نے آپس میں سمجھوتہ اور شکار پر ایک دوسرے سے نہ لڑنے کا خاموش معاہدہ کر لیا۔ ایک ماہ بعد کتے شکار کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم شکار کے لیے نکلے تو سب کی مائیں گلیوں میں یا کوٹھوں پر کھڑی ہمیں گالیاں دے رہی تھیں۔ خدا ان تمام ماؤں کو جنت نصیب کرے۔ ان میں سے آج کوئی بھی زندہ نہیں۔ ہم ماؤں کی گالیوں کی بوچھاڑوں میں دُور ویرانے میں نکل گئے۔ ہم نے راستے میں فیصلہ کیا کہ اگر گوہ سے سامنا ہو گیا تو اسے نظر انداز کریں گے۔ اُس روز ہمارے ساتھ ایک نیا شکاری جوان اور اس کی نئی کتیا تھی۔ تھوڑے ہی دن پہلے اُس نے چھوٹی سی یہ کتیا جہلم سے خریدی تھی اور اس کا نام جیکی رکھا تھا۔ ہمارا یہ دوست ہر وقت اپنی جیکی کی تعریفیں کرتا رہتا تھا۔ ہم جھاڑیوں اور کھڈ نالوں کے علاقے میں پہنچے تو ہمارا تازی کتا اچانک دوڑ پڑا۔ اسے دوڑتا دیکھ کر کتے زنجیریں تڑوانے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ دُور ایک گیدڑ بھاگا جا رہا تھا۔ وہ گہرائیوں میں گم ہو جاتا اور ایک دو منٹ بعد کسی بلند جگہ کھڑا نظر آتا۔ ہماری طرف دیکھتا اور سرپٹ بھاگ اٹھتا۔ ہم نے

کتّوں کو آزاد کر دیا اور نئے شکاری نے جیکی کو بھی کھول دیا۔ کتّوں کے پیچھے ہم بھی بھاگ اٹھے۔

تازی کتّے نے گیدڑ کو جا لیا اور اُسے منہ ڈالنے کی بجائے اسے اپنی مخصوص رفتار پر بھاگتے بھاگتے دھکا دیا۔ گیدڑ لڑھکنیاں کھاتا چلا گیا۔ ابھی اُٹھ ہی رہا تھا کہ تازی کتّے نے گھوم کر اس پر حملہ کیا اور گیدڑ ہماری طرف بھاگا۔ اِدھر سے ہمارے کتّے جا رہے تھے۔ گیدڑ نے رُخ بدلا تو کتّوں نے پھیل کر اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ وہیں کہیں سے دو خرگوش نکلے اور الگ الگ سمتوں کو بھاگ کھڑے ہوئے۔ کتّے تین حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہم گیدڑ کے تعاقب میں دوڑتے رہے۔ گیدڑ، خرگوش اور کتّے کھڈ نالوں میں غائب ہو گئے اور ہم دوڑ دوڑ کر ہانپ گئے۔ اب ہم کتّوں کی آوازوں پر بھاگ رہے تھے۔ ایک نشیب سے آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں لیکن کتّے نظر نہ آتے تھے۔ نیچے جا کے دیکھا تو ایک تنگ سا غار نظر آیا جس کے اندر کشت و خون ہو رہا تھا ہم نے غار میں گھسنے کی کوشش کی لیکن آگے راستہ بہت تنگ تھا۔ اتفاق کی بات تھی یا ہماری خوش قسمتی کہ ہم سب غار کے منہ سے ہٹ آئے۔ ہم ہٹے ہی تھے کہ پھنکار سی سنائی دی اور سیاہی مائل بادامی رنگ کا ایک دو اڑھائی گز لمبا سانپ باہر نکلا۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے پھن پھیلا دیا۔ اس کے پیچھے اسی سائز کا ایک اور سانپ نکلا۔ ہم بھاگ کر بلندی پر ہو گئے لیکن ہمیں کتّوں کے متعلق یہ پریشانی ہونے لگی کہ سانپوں نے کسی کتّے کو ڈس لیا ہو گا۔ ہم نے دُور سے ڈھیلے مارے تو سانپ غار میں واپس جانے کی بجائے ایک طرف بھاگ گئے اور ذرا ہی

دیر بعد ایک کتّا باہر آیا۔ اس کے منہ میں گیدڑ کی ایک ٹانگ تھی۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، چوتھا اور پانچواں کتّا بھی نکل آیا۔ ہر ایک کے منہ میں اپنے اپنے حصّے کا گیدڑ کا گوشت تھا۔ ان کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سانپوں سے محفوظ ہیں۔

ہم دوسرے کتّوں کی تلاش میں نکلے تو ہمیں زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ سب کے سب خود ہی ہمارے پاس آ گئے اور بڑے مزے سے خرگوشوں کا گوشت کھانے بیٹھ گئے۔ ہم تھکن سے چُور زمین پر دراز ہو گئے لیکن ہمارے نئے شکاری دوست کی قہر آلود اور گرجدار آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ اس نے بم کی طرح پھٹتے ہوئے کہا۔ "میری جیکی کہاں ہے؟"

اس کا لہجہ بالکل ایسا تھا جیسے کسی کے سینے پر پستول رکھ کر کہا ہو "ہینڈز اَپ۔ ہلے تو گولی مار دوں گا۔" ہم چونک تو گئے مگر کسی نے اس کی طرف توجّہ نہ دی۔ وہ دراصل بدمزاج انسان تھا۔ اس نے آواز میں اور زیادہ غصّہ اور قہر بھر کر کہا۔ "ستور کے بچّے اپنے اپنے کتّے سنبھال کر لیٹ گئے ہیں۔ میری جیکی کو ڈھونڈو۔" ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تو وہ اور بپھر گیا۔ افضل نے کہہ دیا۔ "چھوڑ دیار، اسے گیدڑ اٹھا لے گیا ہے۔ اب تمہاری جیکی گیدڑوں کو جنم دے گی۔" ہمارے یار نے پہلے تو افضل کو بہت گالیاں دیں پھر کہا۔ "میری جیکی؟ تم اُسے ایسا ویسا سمجھ رہے ہو؟ گیدڑ سامنے آتا تو اس کی بوٹی بوٹی کر دیتی۔" غصّے سے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور ہم اس کی گالیوں پر ہنس رہے تھے۔ جب وہ غصّے سے پاگل ہونے لگا تو ہم سب جیکی کو تلاش کرنے لگے۔ ہر کوئی "جیکی جیکی" پکارنے لگا۔

ہم جیکی کی تلاش میں بکھر گئے۔ تھوڑی دیر بعد ارشد بھاگا آیا اور رازداری سے بولا ــــ "آؤ، آؤ، سبھی آجاؤ، تمہیں جیکی دکھاؤں" ــــ وہ سب کو اکٹھا کر کے کہنے لگا کہ آواز نہ نکلے، دبے پاؤں چلنا، ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ایک نشیب میں نہایت دلچسپ منظر دیکھا۔ ایک جھاڑی کے قریب جیکی اکڑوں بیٹھی تھی اور ایک جنگلی چوہا جو قد کاٹھ میں اوسط درجے کی بلّی جتنا تھا جیکی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جیکی کی شہ رگ کو منہ میں پکڑ رکھا تھا جیکی کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور وہ نہایت برخورداری سے چوہے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ ہم ان کے قریب گئے تو جیکی نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن چوہے نے ہلکا سا جھٹکا دیا تو جیکی پھر بیٹھ گئی۔ ہم سب قہقہہ لگا کر ہنسے مگر چوہا ذرہ بھر نہ ڈرا۔ اتنے میں جیکی کا آقا ہانپتا ہوا آن پہنچا تو میں نے اسے کہا ــــ "یہ لو بھئی، تمہاری جیکی بیٹھی ہے" ــــ اس نے جیکی کو چوہے کی حراست میں دیکھا تو پہلے ایک گالی دی۔ (معلوم نہیں ہمیں یا چوہے کو) پھر ایک پتھر اٹھا کر چوہے کو دے مارا مگر پتھر چوہے کو لگنے کی بجائے جیکی کے سر پر پڑا۔ جیکی اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن چوہے نے اس کی شہ رگ کو نہ چھوڑا اور جھٹک کر جیکی کو پھر بٹھا لیا۔ چوہا بہت ہی نڈر تھا اور تھا بلّی جتنا بڑا۔ ہم سب اس کی طرف بھاگے تو وہ جیکی کو چھوڑ کر قریب ہی اپنے بِل میں لاپتہ ہو گیا۔ جیکی کی ذہنی کیفیت یہ ہو گئی کہ وہ انتہائی تیز رفتار سے ہم سب کے گرد چکر کاٹنے لگی۔ پھر ہر ایک کی ٹانگوں میں گھس کر خوف سے غرّانے اور پھر بھاگنے لگی۔ بڑی

مشکل سے اسے پکڑا اور اس کے گلے میں زنجیر ڈالی لیکن وہ ناچتی کودتی ہی رہی۔

ہمارے کتے ٹیدی، ڑاور خرگوشوں کا گوشت کھا کر اِدھر اُدھر سے پانی پی آئے تھے اور بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ دن کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا ہم ذرا اور آگے نکل گئے اور ہمارے دونوں بُولگیر کتے ایک تنگ سی کھوہ میں منہ ڈال کر پنجے زمین پر رگڑنے اور بے تابی سے بھونکنے لگے۔ اندر ضرور کوئی جانور تھا۔ ہم نے بُل ٹیریر اور ایک مونگریل نسل کے کتے کو کھول دیا۔ وہ سیدھے کھوہ کے منہ میں گئے اور مونگریل اندر چلا گیا۔ اندر سے اس کا واویلا سنائی دیا۔ جیسے اسے کوئی چوٹ پڑی ہو۔ اس کے پیچھے بُل ٹیریر بھی اندر چلا گیا۔ ہم صرف آوازوں سے بتا سکتے تھے کہ اندر کوئی معرکہ لڑا جا رہا ہے۔ دس بارہ منٹ بعد بُل ٹیریر باہر نکلا۔ وہ بہت ہی بے چین تھا۔ پھر مونگریل کی دُم پھر پچھلی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ کسی چیز کو گھسیٹ کر لا رہا تھا۔ آخر وہ باہر نکل آیا تو دیکھا کہ اس نے ایک سیہہ کے منہ کو منہ میں جکڑ رکھا تھا۔

سیہہ جسے سہی بھی کہتے ہیں چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والا جانور ہوتا ہے۔ اس کے تمام جسم پر تین انچ سے بارہ انچ تک لمبے کانٹے ہوتے ہیں جن کا رنگ سیاہ اور سفید ہوتا ہے۔ ان کی نوکیں بہت تیز اور کسی حد تک زہریلی ہوتی ہیں۔ ان کانٹوں میں سیہہ کا صرف منہ نظر آتا ہے۔ خطرے کے وقت سیہہ تمام کانٹے کھڑے کر لیتا ہے اور کوئی کتا، بھیڑیا یا کوئی اور درندہ اسے کہیں سے بھی نہیں پکڑ سکتا۔ کتا قریب جاتے تو سیہہ کانٹوں کو زور سے کھڑا کر لیتا ہے اور کتے کا منہ جگہ جگہ سے زخمی ہو جاتا ہے۔ یہ جانور گندم کی

فصل اور گھاس کھاتا ہے۔ اس کے پاؤں انسان کے ننھے سے بچے کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک روایت مشہور ہے کہ اگر سیہہ کا کانٹا کسی کے گھر کی دیوار میں رکھ دو تو اس گھر میں ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی ہے۔

خوش قسمتی سے ہمارے کتے کے منہ میں سیہہ کا منہ آگیا تھا اور وہ اسے گھسیٹ لایا تھا جونہی دوسرا کتا اس پر حملہ آور ہوا سیہہ نے کانٹوں سے اس کا استقبال کیا۔ اس کتے کے چہرے سے جگہ جگہ خون بہنے لگا۔ مونگریل نے اس کا منہ نہ چھوڑا۔ دوسرے کتے زنجیروں میں تھے اور ہمیں گھسیٹ رہے تھے لیکن ہم انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ورنہ سب زخمی ہو جاتے آخر انہیں چھوڑ دیا اور اکیلے سیہہ نے جس کا منہ ایک کتے کے منہ میں تھا تمام کتوں کو کانٹوں سے زخمی کر دیا۔ لیکن مونگریل نے سیہہ کا منہ چباڈالا اور اس کے کانٹے بے جان ہو کر اس کے جسم کے ساتھ چپک گئے۔ ہم سیہہ کو گاؤں میں گھسیٹ لائے۔ کتے امن سے انتقام لینے کو ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے لیکن کانٹوں کو دیکھ کر پیچھے ہٹ آتے تھے۔

ہم نے سیہہ کا پیٹ چاک کر کے کھال اتار دی اور کتوں نے اس کا گوشت کھالیا۔ اس کی کھال سے کانٹے نکال دیے گئے۔ یہ سینکڑوں کانٹے گاؤں کے بچوں کے ہاتھ لگے تو گھر گھر سے گالیوں اور لعن طعن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی بھی گھرانا اس منحوس کانٹے کو اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بچوں نے کانٹے گھروں میں اور ادھر اُدھر چھپا دیے۔ ہم نے بھی تجربے کے طور پر ایک دو مکانوں کی دیواروں میں کانٹے رکھ دیے لیکن کسی گھر میں لڑائی نہ ہوئی۔ کتوں نے سیہہ کا گوشت کھالیا تو ہمیں بزرگوں نے بتایا کہ اس کا گوشت بہت گرم ہوتا ہے۔ ہم نے اس کا اثر فوراً دیکھ لیا۔

کتوں کا یہ حال ہو گیا کہ ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور وہ پانی پیتے جا رہے تھے۔ کوئی دو گھنٹوں میں انہوں نے اتنا پانی پی لیا جتنا وہ دونوں میں پیا کرتے تھے۔ بعض کتوں کا پسینہ بھی نکل آیا تھا۔

اس کے بعد ہم آٹھویں دسویں روز شکار پر جانے لگے۔ ایک بار ایک کتا کھوہ میں داخل ہوا تو چیختا اور تڑپتا ہوا باہر نکلا۔ وہ گرا اور مر گیا۔ اس کا سارا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ اب ہم دو ٹارچیں بھی ساتھ لے جانے لگے تھے کیوں کہ غاروں اور کھوہوں کے اندر دیکھنا پڑتا تھا۔ افضل ٹارچ لے کر اندر گیا تو وہ بھی بھاگ آیا۔ کہنے لگا کہ اندر بہت بڑا سانپ بیٹھا ہے۔ ایک دو کلہاڑیاں اور ایک دو لاٹھیاں تو ہمارے پاس ہوتی ہی تھیں۔ ہم نے کھوہ کے دہانے کے قریب چھپ کر بیٹھنے کی جگہ بنا لی اور کلہاڑیاں تان کر دو لڑکے بیٹھ گئے۔ افضل پھر کھوہ میں گیا اور سانپ کو لاٹھی سے چھیڑ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ سانپ پھنکار کر اس کی طرف دوڑا۔ یہ بڑی خطرناک حرکت تھی۔ افضل خاصا پھرتیلا نوجوان تھا۔ اس نے لاٹھی لمبی کر کے آگے رکھی اور سانپ لاٹھی پر حملے کرتا باہر نکل آیا۔ جونہی باہر نکلا اس پر دو کلہاڑیاں پڑیں اور سانپ تین حصوں میں کٹ گیا۔ دونوں بوکیر کتے کھوہ کے اندر چلے گئے۔ اب اندر سے کتوں کے ساتھ گیدڑ کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں اور تھوڑی دیر بعد دو گیدڑ نکلے اور راکٹوں کی طرح ہمارے درمیان سے گزر گئے۔ کتے پیچھے بھاگے اور کوئی دو سو گز دُور دونوں کو جا لیا۔ پھر اسی کھوہ سے ایک سیہہ نکل آیا جس نے بھاگنے کی بجائے ایک جگہ رُک کر تمام کتوں کا مقابلہ کیا۔ کتے اس کے منہ کو پکڑنا چاہتے تھے لیکن سیہہ ہر بار کانٹے کھڑے کر کے کتوں کو زخمی کر دیتا تھا۔ جب کتے

بے حال ہو گئے تو ہم نے کلہاڑیوں سے سیہہ کو مار دیا۔

چار سال گزر گئے۔ ہم چھوکرے اس قدر تیز اور ہماری ٹانگوں میں اس قدر قوت پیدا ہو گئی تھی کہ ہم ٹیلوں، ٹیکریوں اور کھڈ نالوں کو کتوں کے ساتھ پھلانگتے چلے جاتے تھے۔ بھیڑیوں میں اتنی جان تھی کہ کسی نوجوان کا دم پھولتا نہیں تھا۔ اس عرصے میں ہماری شکاری پارٹی کی نفری چالیس اور کتوں کی تعداد تیس تک پہنچ چکی تھی لیکن اس فوج میں اب جیکی اور اس کا آقا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جیکی ہمارے کتوں میں گھل مل گئی تو ہمارے چار نہایت اعلیٰ النسل کے کتے شکار سے منہ پھیر کر جیکی کی محبت کا شکار ہو گئے۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں رقابت بھی ضرور ہوتی ہے۔ یہ چاروں کتے ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے ایک روز ایک گیدڑ کے پیچھے بھاگتے آلیس میں جنگ نہ کرنے کے معاہدے کو توڑ دیا۔ ان میں کیمبل پور سے منگوایا ہوا ایک لڑنے والا خونخوار کتا تینوں رقیبوں کو بُری طرح پٹخ کر جیکی کو ساتھ لیے الگ جا بیٹھا۔ پھر اُس نے محبت کا یہ ثبوت پیش کیا کہ جب کتے گیدڑ کا گوشت کھا رہے تھے تو اس کتے نے ایک کتے کو گردن سے جا دبوچا اور اسے بے رحمی سے جھنجھوڑ کر پرے پھینک دیا پھر اس کے حصے کا گیدڑ کا گوشت اٹھا کر جیکی کے سامنے جا رکھا۔ جیکی گوشت کھانے لگی تو اس کا چاہنے والا یہ خونخوار کتا اُس کے منہ پر بڑے پیار سے زبان پھیرنے لگا۔ اسی شام ارشد اور افضل کے کتوں کے طویلے میں ان تینوں کتوں نے جیکی کے عاشق پر ہلہ بول دیا اور اس کی خوب گت بنائی۔

جب ہم چند دن بعد پھر شکار پر چلنے لگے تو ہم نے جیکی کے آقا سے کہا کہ خود آ جاؤ،

جیکی کو ساتھ نہ لے چلو کیونکہ ہمارے کتے خراب ہوتے ہیں۔ اس پر وہ ناراض ہو گیا اور جیکی کو ساتھ لیے گھر چلا گیا۔ جب ہم شکار سے واپس آئے تو گاؤں والوں سے معلوم ہوا کہ اچھو ہم سب سے سخت ناراض ہے۔ کہتا ہے کہ میں جیکی کو ان کے کتوں کے ساتھ کبھی نہیں لے جاؤں گا۔ ان کے کتے کمین نسل کے ہیں۔ پھر اُس نے بڑے غصّے سے کہا: "ان کے تمام کتے بدمعاش ہیں۔"

اس لمبے عرصے میں ہم نے بڑے بڑے خطرناک کام کیے جن میں ایک یہ تھا کہ ہم ان غاروں میں دُور اندر تک چلے جاتے تھے اور زمین دوز بھول بھلیوں میں گھوم آتے تھے جو اوپر سے بہتے ہوئے پانی نے بنائی ہوئی تھیں۔ اس طرح کتوں کی بجائے ہم خود (ایک یا دو آدمی) اندر جا کر شکار کو باہر نکالتے تھے۔ کئی بار سانپوں سے سامنا ہوا۔ بعض اوقات گوہ سامنے آ گئی اور اُس نے دُم سے حملہ کر دیا، اور ایک بار ایک لومڑی سامنے آ گئی جو اچک کر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ ہم نے ٹارچ کی روشنی اُس کی آنکھوں پر مرکوز رکھی اور پیچھے ہٹتے آئے اور اس طرح اسے باہر نکال لائے۔ باہر آتے ہی کتوں نے اسے دبوچ لیا اور لومڑی کا نام و نشان نہ رہا۔

اس دوران ایک عجیب قسم کا حادثہ ہو گیا جس کے متعلق میں کوئی رائے نہیں دوں گا۔ بات یوں ہوئی کہ ہم اکثر سیہہ کو مار لاتے تھے۔ بزرگوں نے ہمیں کئی بار بتایا تھا کہ اس کا گوشت جسمانی قوت کے لیے اکسیر ہوتا ہے اور جو آدمی دو چار مرتبہ اس کا گوشت کھا لے وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اس کی تصدیق ایک خانہ بدوش سنیاسی نے کر دی اور اس نے ہمیں یہ بھی کہا کہ وہ ہم سے مری ہوئی سیہہ دس روپوں میں خرید لیا کرے گا (اُس زمانے کے دس روپے آج کے ایک سو روپے کے برابر تھے)

ہم چونکہ نوجوان تھے اور بے فکرے۔ ہم نے مولویوں سے پوچھا کہ کیا سیہہ حلال ہے۔ ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ جانور گوشت اور مُردار نہیں کھاتا بلکہ فصل اور گھاس کھاتا ہے۔ ہم نے قصبے کے ایک عالم سے بھی جا پوچھا۔ زیادہ تعداد ان مولویوں کی تھی جنہوں نے فتویٰ دیا کہ سیہہ حلال ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک نوجوان تھا۔ (جس کا نام آفتاب سمجھ لیجئے اصلی نام لکھنے سے گریز کروں گا) آفتاب بچپن سے مذہب کا طالب علم بن گیا تھا۔ وہ جہلم میں تین سال کسی عالم کی شاگردی میں رہا تھا پھر اس نے گاؤں کی مسجد میں آکر ورد وظیفے اور رات رات بھر جاگ کر چلہ کشی شروع کر دی تھی۔ اُس نے دو ٹوک فتویٰ دے دیا کہ سیہہ حلال ہے۔ اتفاق سے ہم ایک سیہہ کو شکار کر لائے تھے جو ابھی مری نہیں تھی۔ اسے ذبح کیا اور اس کا تھوڑا سا گوشت ہم نے ارشد اور افضل کے گھر خود ہی پکایا۔ آفتاب نے اپنے فتوے پر عمل کرتے ہوئے بہت سا گوشت کھا لیا مگر ہم میں سے کسی نے بھی نہ کھایا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم نے کیوں نہیں کھایا تھا۔ شاید کچھ کراہیت سی محسوس ہوئی تھی۔

اسی رات گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ آفتاب کو کوئی خوفناک روگ لگ گیا ہے ہم اس کے گھر گئے تو وہ بستر میں چت لیٹا تھا۔ ہمیں دیکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ اس کی آنکھیں باہر آ رہی تھیں۔ چہرے پہ اینٹھن اور رگوں میں کھچاؤ صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم دوستوں نے اسے باری باری بلایا مگر وہ ہمیں پہچان نہ سکا اور قہقہے لگاتا رہا۔ پھر یک لخت چُپ ہو گیا اور گرج کر بولا۔ "پانی پلاؤ۔ پانی پلاؤ" —— اس کی ماں پانی لے آئی۔ ہم چار آدمیوں نے اسے بٹھایا اور پیٹھ پیچھے سہارا دیا۔ اُس نے پانی کا ایک گلاس ایک سانس میں پی ڈالا اور پھر گرج کر بولا۔ "پانی پلاؤ۔ پانی

پلاؤ" یقین کیجئے کہ وہ پانی مانگتا رہا اور پیتا رہا اور کم و بیش ایک گیلن پانی پی گیا۔ ہم نے اسے لٹا دیا اور وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔ اس کا چہرہ پہلے سُرخ تھا پھر نیلا پڑنے لگا۔ ہم آدھی رات کے بعد اپنے اپنے گھروں کو آ گئے۔ رات کو ہی دوسرے گاؤں سے ایک حکیم کو بلا لیا گیا۔ اپنے گاؤں کے پیش امام نے تعویذ لکھ کر اس کے بازوؤں کے ساتھ باندھ دیئے اور تمام رات اس کے سرہانے قرآن پڑھتا رہا۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ آفتاب قہقہے لگاتا رہا اور پانی پیتا رہا۔ رات کا پہلا پہر تھا کہ ہمیں گاؤں کی اس گلی میں جو آفتاب کے گھر کو جاتی تھی عورتوں کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ اپنے بھائیوں اور خاوندوں کو پکار رہی تھیں۔ میں بھاگ کے پہنچا۔ میرے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ گاؤں کے سارے ہی نوجوان کلہاڑیاں اور چھویاں لے کے نکل آئے۔ دیکھا کہ چار عورتیں دیوار کے ساتھ دبکی ہوئی خوفزدہ ہو کر چیخ رہی ہیں اور ایک دوسری کے پیچھے چھُپ رہی ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا تو سب بیک وقت بولنے لگیں —— "یہ دیکھو یہ اتنے سارے لوگ نیزے اٹھائے ہوئے ہمیں اٹھا لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں دیکھو" —— وہ خلا میں اشارے کر رہی تھیں مگر ہمیں نیزوں والے لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم نے چاروں عورتوں کو گھیرے میں لے لیا اور قریب کے مکان میں لے گئے۔ وہ بہت ہی زیادہ خوفزدہ تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ آفتاب کی بیمار پُرسی کے لیے گئی تھیں۔ جب اس کے گھر سے نکل کر یہاں پہنچیں تو اچانک بیس پچیس بلتے ٹرنگے مرد ہاتھوں میں نیزے اٹھائے ان کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے ساتھ چلو۔

ان عورتوں نے ان مردوں کا حلیہ یہ بتایا کہ ان کے سر اور چہرے صافوں میں

لپٹے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں اور ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے لمبے تھے اور گردنیں بھی بہت لمبی تھیں۔

اُس وقت تو ہم سب ڈر گئے تھے اور یقین کر بیٹھے تھے کہ آفتاب پر شہر شرار کا قبضہ ہو گیا ہے۔ جب انہوں نے آفتاب کے قہقہے سُنے اور اس کی باہر نکلی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو ان عورتوں کو شہر شرار نظر آنے لگا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر باہر نکلیں تو چاروں میں سے ایک نے چیخ مار کر کہا۔ "یہ دیکھو کون ہیں نیزے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھیں دیکھو" ——— اور دوسری عورتوں کو بھی وہی کچھ نظر آنے لگا۔ یہ شاید اُن کے تصور کا تصور تھا جو انہیں سامنے دکھائی دینے لگا تھا یہ خبر بھی گاؤں میں مشہور ہو گئی اور اُس رات جو بھی عورت آفتاب کو دیکھ کر گلی میں آئی اسے نیزوں والے یہ مرد نظر آئے اور وہ چیخیں مارتی بھاگ اُٹھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کسی مرد نے کوئی ایسا آدمی نہ دیکھا۔ ہم رات بھر کلہاڑیاں اور لاٹھیاں اٹھائے گلیوں میں پہرہ دیتے رہے۔ اس دوران پیش امام نے یہ انکشاف کر دیا کہ آفتاب ایک چلّہ کر رہا تھا جس کے دوران اسے گوشت اور خصوصاً سیہہ جیسے جانور کا گوشت نہیں کھانا چاہیئے تھا جس کے متعلق ابھی مستند فیصلہ نہیں ہُوا تھا کہ حلال ہے یا حرام۔

بہر حال پیش امام نے فتویٰ دیا کہ چلّہ اُلٹ گیا ہے اور اب شہر شرار اور بھوت پریت گاؤں میں اُتر آئے ہیں۔ پیش امام کے اس انکشاف نے گاؤں میں دہشت طاری کر دی اور گھر گھر سے قرآن کی صدائیں اٹھنے لگیں۔

دوسرے دن ہم دو تین دوست بوڑھوں، سیانوں اور پیش امام کی مرضی

کے خلاف گھوڑوں پر پانچ میل دُور قصبے میں گئے۔ ایک خالی گھوڑی ساتھ تھی۔ وہاں ایک ہندو ڈاکٹر ہوتا تھا۔ اسے آفتاب کا حال بتایا اور کہا کہ گھوڑی ساتھ ہے ہمارے ساتھ چلو۔ ہم نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اگر آفتاب کو ٹھیک کر دے تو ہم اسے ملکہ وکٹوریہ کے روپوں کی پُوری تھیلی پیش کریں گے۔ اُس زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والا روپیہ چلتا تھا جس کی چاندی خالص ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کو گھوڑی پر بٹھایا اور گاؤں لائے۔ اُس نے آفتاب کو دیکھ کر کہا کہ گردن توڑ بخار ہے۔ گردن توڑ بخار کیا ہوتا ہے؟ ہمیں آج تک علم نہیں ہو سکا۔ اُس دَور میں ہم نے بڑے بخار، باری کے تاپ، سُوکھے اور نمونیے کے سوا کسی اور بیماری کا نام نہیں سُنا تھا نہ اُن دنوں انجکشن اور طرح طرح کی دوائیاں ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر نے جب یہ سُنا کہ اس نے سیہہ کا گوشت کھایا ہے تو اُس نے سر جُھکا لیا اور کہا کہ اب اسے پانی پلاتے رہو تاکہ موت کی تلخی سے محفوظ رہے اور دعا کرو کہ جلدی مر جائے۔ جب ہم ڈاکٹر کو قصبے میں چھوڑ کر واپس آئے تو آفتاب مر چکا تھا۔ اُس دَور کے لوگ اب بھی کہتے ہیں کہ چلّہ الٹ گیا تھا مگر میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا روگ تھا جسے ڈاکٹر نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ سارا فتور سیہہ کے گوشت کا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ سیہہ نے کوئی زہریلی چیز کھائی ہو۔ جس کا اثر اس کے گوشت میں رہ گیا ہو۔ یہ دراصل چلّہ نہیں بلکہ مولویوں کا اپنا فتویٰ الٹ گیا تھا۔

ہمارے گاؤں کا یہ دوسرا نوجوان ہمارے شکار کے جنون کا شکار ہو گیا تھا۔ ہم نے آفتاب کے چالیسویں کے بعد شکار کا ایک اور پروگرام بنایا اور اب کے بہت دُور پہاڑیوں تک جانے کا ارادہ کیا۔ ہم نے چھوٹی عمر کے لڑکوں کو ساتھ جانے سے

روک دیا کیونکہ ہماری مسافت بہت لمبی تھی۔ کوئی چھ میل گئے ہوں گے کہ مٹی کی ایک عمودی دیوار میں ایک غار دیکھی۔ دیوار کے اوپر سے لے کر دُور تک اونچے نیچے کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بُوگیر کتّے غار کے اندر چلے گئے اور ہم باہر رُک گئے۔ دوسرے کتّے شکار کے انتظار میں بے تاب تھے۔ ہم دراصل دس میل اور آگے پہاڑیوں تک جانا چاہتے تھے جن کا سلسلہ سکسیہ کی خوبصورت وادی تک چلا پہنچتا ہے۔ کتّوں کو جانے کیسی مُشک آئی کہ وہ غار میں گھس گئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ ہم نے باہر سے کتّوں کو پکارا۔ دسلیں بجائیں لیکن کتّے باہر نہ آئے۔ یہ غار ہمارے علاقے کے اُن مخصوص قدرتی غاروں میں سے ایک تھا جو اوپر کے سیلابی پانی کا زمین دوز راستہ ہوتا ہے۔ اندر اس کے کئی راستے بن جاتے ہیں۔

ارشد اندر چلا گیا۔ بدقسمتی سے ہم کوئی ٹارچ ساتھ نہیں لے گئے تھے کیونکہ ہمارا پروگرام غاروں کے اندر جانے کا نہیں تھا۔ ارشد کو گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو ہم نے آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں غار میں داخل ہوا۔ وہاں زیادہ چوڑا اور اونچا نہیں تھا۔ جھک کر اندر جانا پڑتا تھا۔ میں اندر گیا تو چار پانچ قدموں بعد اندھیرا راستہ دائیں طرف مڑ گیا۔ آگے گھُپ اندھیرا تھا۔ میں دیواروں کو ٹٹولتا آگے بڑھتا گیا۔ چند قدم آگے راستہ بند ہوگیا۔ میں نے دائیں اور بائیں ٹٹولا تو کوئی اور راستہ نظر نہ آیا۔ میں واپس آیا تو اچانک ایک اور راستہ آگیا۔ میں اُدھر مڑا اور غار کے دہانے پر جا پہنچا۔ اندر کے اندھیرے اور گھٹن سے دل ڈوب رہا تھا۔ ارشد یقیناً اندر کی اندھیری بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ ہم

سب گھبرا گئے۔ پھر میں اور ارشد کا بڑا بھائی افضل اندر گئے۔ ٹارچیں ساتھ نہ لانے پر ایک دوسرے کو لعنت ملامت کی۔ اندھیرا اتنا گہرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

میں آگے آگے تھا۔ جن راستوں سے میں واپس آیا تھا، ہم دونوں نے وہی راستے پھر دیکھے۔ افضل نے چھت کو ٹٹولا تو ایک جگہ اوپر چھت کھلی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک طرف دیوار ڈھلانی تھی۔ افضل اوپر چڑھ گیا اور اس نے مجھے آواز دی۔ میں بھی اوپر گیا۔ اوپر ایک خاصا کھلا راستہ تھا اور گھُپ اندھیرا۔ ہم نے ارشد کو آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ یہ راستہ آگے سے بند تھا۔ ہم نے دیواروں کو ٹٹولا اور ایک طرف راستہ تو نظر آگیا لیکن اس قدر فراخ کہ اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے کے باوجود کوئی دیوار محسوس نہ ہوئی۔ فرش اونچا نیچا تھا۔ ہم جھکے جھکے اِدھر اُدھر چلنے لگے اور راستہ آگیا لیکن دم گھٹنے لگا۔ اس کے علاوہ یہ ڈر بھی محسوس ہونے لگا کہ کہیں بھٹک نہ جائیں۔ اس وقت تک ہم جہاں جہاں گئے تھے وہ تمام راستے ذہن سے اترتے جا رہے تھے۔ اندر کی اندھیری اور ڈراؤنی فضا کا یہ اثر خاص طور پر محسوس کیا کہ دماغ سوچنے سے عاری ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے ارشد کو پھر آوازیں دیں۔ افضل نے اپنے کتّوں کو بلایا لیکن خاموشی۔

ہم واپس ہوئے اور ایک معجزہ ہے کہ ہم اوپر کے حصّے سے نیچے اُترآتے پھر نیچے کے راستوں سے گزرتے باہر نکل آئے۔ ہماری گھبراہٹ بڑھ گئی۔ ہم سب دوڑ کر ٹیلے کے اوپر چلے گئے اور سب ساتھی پھیل کر دیکھنے لگے کہ غار کا اوپر کا راستہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ دُور دُور تک زمین پر کوئی کھلا دہانہ نظر نہ آیا۔ پانچ چھ سو گز دُور چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ ہم گاؤں میں بھاگے گئے۔ بہت سے آدمی ہمارے

گرد جمع ہو گئے۔ ہم نے گھبراہٹ کے عالم میں انہیں بتایا کہ ہمارا ایک ساتھی غار میں گم ہو گیا ہے۔ دس بارہ آدمی گھروں کو بھاگے اور کدالیں اور بیلچے لے کے نکل آئے۔ ان کی حرکات میں اس قدر پھرتی تھی کہ ہم اور زیادہ ڈر گئے۔ ایک بوڑھے نے ہمیں گالی دے کر کہا کہ تم نے اچھا بھلا جوان گم کر دیا ہے۔ تم اس علاقے کے رہنے والے ہو۔ اور تمہیں معلوم نہیں کہ "پانی مار" کے اندر کے راستے کتنے خطرناک راستے ہوتے ہیں۔ ان میں جن بھوت بھی جا کر نہیں نکل سکتے۔ ایک نے کہا — "چارپائی اور پانی کا گھڑا بھی لے چلو" — چارپائی کے نام سے ہمارے دل ڈوب گئے۔ ہم ارشد جیسے خوبرو اور خوش طبع نوجوان کو ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دل اس حادثے کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ کیا وہ لوگ ارشد کی لاش اٹھانے کے لیے چارپائی ساتھ لے جا رہے تھے؟

گاؤں کے دس بارہ آدمی کدالیں اور بیلچے اٹھائے سرپٹ بھاگتے غار کے منہ تک پہنچے۔ ان کے پیچھے پیچھے چارپائی اور پانی کا گھڑا آ گیا۔ ایک آدمی غار کے اندر آ گیا اور باہر نکل آیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ اندر جانا بیکار ہے۔ وہ سب اوپر چلے گئے ایک بوڑھے نے ہم سے پوچھا کہ اوپر سے بتاؤ کہ تم غار کے اندر کس کس سمت کو گئے تھے۔ میں نے اور افضل نے اندازے کے مطابق اوپر لکیر ڈال کر گاؤں والوں کو وہ زمین دور تک راستہ سمجھایا جہاں ہم گئے تھے۔ بوڑھے نے زمین پر کئی جگہوں پر لاٹھی کا سہارا مارا اور ایک جگہ رک کر کہنے لگا کہ یہاں سے کھودو، کھودو دور نہیں ہے۔ گاؤں والوں نے دیکھتے ہی دیکھتے تین چار گز چوڑا اور ڈیڑھ دو گز گہرا گڑھا کھود ڈالا پھر کسی نے کہا — "اب آہستہ" اور دو کدالیں پڑیں تو نیچے سے زمین بیٹھ گئی اور کوئی

پانچ چھ گز گہرائی میں تہہ نظر آنے لگی۔ دو آدمی نیچے اتر گئے اور غائب ہو گئے۔ وہ بلند آواز سے باہر والوں کو بتاتے رہے کہ وہ کہاں ہیں۔ بوڑھا دہانے پر بیٹھا انہیں پکار پکار کر ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بوڑھے کو نظر آ رہا ہے کہ زمین کے اندر کیا ہے۔

چند منٹوں بعد زمین کے نیچے سے آواز آئی "مل گیا۔ مل گیا" پھر آواز آئی "ابھی زندہ ہے" ہمارے دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگے اور ہماری نظریں گڑھے کے اندر کے دہانے پر جم گئیں۔ بہت دیر بعد (جو شاید بہت زیادہ نہیں تھی) دہانے میں ایک آدمی نظر آیا۔ اور اس کے کندھے پر ارشد کی ٹانگیں تھیں۔ دوسرا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے کندھے کی طرف سے ارشد کو اٹھا رکھا ہو گا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ارشد کو سیدھا کیا۔ اس کا سر کندھوں پر ڈھلکا ہوا تھا اور وہ بیہوش تھا۔ دونوں آدمیوں نے اسے کھڑا کر کے اوپر اٹھایا تو اوپر سے دو آدمیوں نے جھک کر اسے کندھوں سے پکڑا اور آہستہ آہستہ باہر نکال لیا۔ اسے چارپائی پر ڈالا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ ساتھ ہی منہ کھول کر مٹکے سے پانی ڈالا گیا لیکن ارشد ہوش میں نہ آیا۔ گاؤں والوں نے چارپائی اٹھائی اور گاؤں کو چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے ہمارے باپ دادا کے نام پوچھے۔ ہم ان کے لیے اجنبی نہیں تھے، وہ ہمارے گاؤں کے ہر بڑی عمر کے آدمی کو جانتے تھے۔

گاؤں میں ایک حکیم تھا۔ اس نے ارشد کی ناک کے سامنے خشک سی کوئی جڑی بوٹی رکھ دی۔ اور ایک آدمی سے کہا کہ اس کے سینے پر آہستہ آہستہ مالش کرتے رہیں۔ ہم حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ارشد کا رنگ لاش کی طرح

زرد تھا۔ حکیم نے اس کے منہ میں ایک دوائی کے چند قطرے ڈالے اور تقریباً تین گھنٹوں بعد ارشد نے آنکھ کھولی۔ وہ گھبرانے والا جوان نہیں تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ ہم نے حال پوچھا تو اُس نے مسکرا کر سر ہلایا کہ ٹھیک ہوں۔ دن کے پچھلے پہر تک وہ اُٹھ بیٹھا لیکن بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ہم نے گاؤں والوں سے کہا کہ ہمیں ایک گھوڑی دے دیں۔ ارشد کو اس پر بٹھا کر لے جائیں گے لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا تو ہم خود اسے تمہارے گاؤں پہنچا دیں گے۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ اس حالت میں ہم اسے بھیج دیں۔ ہم پندرہ سولہ لڑکے تھے۔ گاؤں والوں نے ہمیں مرغیاں کھلائیں اور آٹھ مرغیاں ذبح کر کے ان کے پراتارے اور مرغیاں ہمارے کتوں کے آگے پھینک دیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ہمارے کتوں کے پیٹ دودھ کی پوری بالٹی آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ دودھ کئی گھروں سے جمع کیا گیا ہے۔ شام کے وقت ہم ارشد کو وہیں چھوڑ کر اپنے گاؤں پہنچے اور ارشد کے متعلق سب کو اطلاع دی۔ اسی شام ارشد کی ماں اور برادری کے دو تین آدمی اس گاؤں چلے گئے۔ تیسرے روز ارشد بالکل صحت یاب ہو گیا تو اسے اپنے گاؤں آنے کی اجازت ملی۔

ارشد اتنا ہی بتاتا تھا کہ وہ غار میں داخل ہو کر اوپر والے سوراخ میں داخل ہو گیا تھا۔ وہاں سے اسے کھلا راستہ ملتا گیا جو کئی جگہوں سے بند تھا لیکن کوئی نہ کوئی راستہ مل جاتا تھا۔ کتے اس کے آگے تھے اور اُسے ان کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ پھر اس کا سر چکرانے لگا اور وہ واپس چل پڑا تھا۔ وہ کئی ایک راستوں پر چلا مگر ہر راستہ بند تھا۔ پھر اسے کوئی ہوش نہ رہا۔ جن دو آدمیوں نے اسے

زمین کی ان ہولناک بھول بھلیوں سے نکالا تھا، انہوں نے بتایا کہ ارشد زمین کے نیچے کی دنیا میں ایک فراخ جگہ کھڑا تھا جہاں کی چھت خاصی اونچی تھی۔ اس کی پیٹھ دیوار کے ساتھ تھی اور سر کندھے پر ڈھلکا ہوا تھا اور سخت تیز بدبو تھی۔ جیسے قریب ہی مُردار پڑے ہوئے ہوں۔ ارشد کا مر جانا یقینی تھا پھر اس کی لاش بھی نہ ملتی لیکن گاؤں والوں کو اندازہ تھا کہ پانی کا راستہ کہاں سے کہاں تک ہے۔

ارشد بظاہر صحت یاب ہو گیا لیکن اس کے پھیپھڑے دن بدن خراب ہونے لگے اور دق کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ راولپنڈی جا کر ایکسرے کرایا تو پھیپھڑے صاف نکلے لیکن پھیپھڑوں کے روگ نے اسے چارپائی پر ڈال دیا۔ بہت علاج کرائے لیکن ارشد بہت ہی تیزی سے آخری منزل کو جا رہا تھا۔ کسی ڈاکٹر کو مرض کا سراغ نہ ملا اور ایک مہینے تک ارشد ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ زمین کے اندر کیسے زہریلے جراثیم اس کے پھیپھڑوں اور جگر میں گھر کر گئے تھے۔

ہمارا شکار ختم ہو گیا۔ ارشد ہی تو روحِ رواں تھا۔ اس کے بھائی نے کتے فروخت کرنے کا ارادہ کیا تو گاؤں کے بزرگوں نے ہم سب کو اکٹھا کر کے کہا کہ مرے ہوؤں کے ساتھ جیتے جی نہ مرو۔ گاؤں میں شکار کے شوق کو قائم رکھو جس بزرگ نے پہلی جنگِ عظیم لڑی تھی۔ اس نے کہا — "بچو ایک دوسرے کے پیچھے مرتے چلے جاؤ اور اس بھاگ دوڑ کو نہ چھوڑو۔ بیکار بیٹھ کر کیا کرو گے؟ گاؤں کی لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر ہیر وارث شاہ گاتے رہو گے۔ اٹھو اور بھاگو دوڑو۔"

بزرگوں کی حوصلہ افزائی ہمیں پھر کھڈ نالوں میں لے گئی۔ ہمارے ساتھی ایک

ایک کر کے فوج میں بھرتی ہوتے گئے اور ان کی جگہ نئے لڑکے ہماری پارٹی میں شریک ہوتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد زمانہ ایسا بدلا کہ لڑکوں کے انداز بدلنے لگے۔ پھر گاؤں میں ٹرانسسٹر اور ان کے ساتھ فلمی گانے آ گئے۔ لڑکے دس میل کا فاصلہ طے کر کے قصبے میں فلمیں دیکھنے جانے لگے۔ دیہات میں ہیر، سوہنی اور سسّی کی جگہ صبیحہ، مسرت نذیر اور نیلو نے لے لی اور یہاں بھی عشق و محبت کے ڈرامے شروع ہو گئے لیکن ہم چوٹیلوں اور ٹیکریوں کو پھلانگتے جوان ہوئے تھے بہت سے لڑکوں کو اپنے ساتھ بھگا بھگا کر جوان کیا تھا وہ سب کشمیر کی پہلی جنگ لڑے پھر وہ ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ لڑے۔ تقریباً سبھی محاذوں پر ہمارے گاؤں کا ایک ایک جوان موجود تھا۔ ان میں چھ جوان کمانڈو میں بھی تھے جو دشمن کے مورچوں کے پیچھے جا کر دشمن کی کمر توڑتے رہے۔

ہمارے گاؤں کے جانبازوں میں سے چھ شہید ہوئے۔ چار جسمانی لحاظ سے معذور ہو کر گھر آ گئے اور باقی ابھی پاک فوج میں ہیں۔ وہ جب جنگ کی باتیں سناتے ہیں تو شکار والی اصطلاحیں بولتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں دشمن گیدڑ یا خرگوش تھا۔ وہ اکثر سنایا کرتے ہیں کہ وہ رات کی پٹرول (گشت) پر جاتے تھے تو دشمن کی پوزیشنوں میں چلے جایا کرتے تھے۔ اور دشمن کے ایمونیشن ڈمپ کی مُشک لے لیا کرتے تھے۔ پھر گرینیڈ پھینک کر سارا ایمونیشن اڑا کر رکھ دیتے تھے کشمیر کی پہاڑیوں پر وہ بندروں کی طرح چڑھ جاتے تھے، اور دشمن کو وادیوں میں بکھیر کر تباہ کر دیتے تھے۔

مجھے ڈر تھا کہ شکار ختم ہو گیا ہے اور شکار کا شوق بھی گاؤں میں نہیں رہا۔

اس لیے گاؤں کے نوجوانوں کے خون کو گرم رکھنے کا کوئی بہانہ نہیں رہا لیکن چھ شہیدوں کی قبروں اور چار معذور غازیوں اور حاضر نوکری کے مجاہدوں کی بہادری کی کہانیوں نے گاؤں کا خون ایسا گرمایا ہے کہ اب ٹھنڈا نہیں ہو سکے گا۔

شہباز اور فاطمہ

محبت اور مردانگی کی خونچکاں داستان — کتے اور
انسان کی محبت۔ ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کی محبت۔
خون ہی خون۔ ایثار ہی ایثار۔ معرکہ در معرکہ۔

کہانی میری نہیں، میرے ایک دوست شیر خان راجہ کی ہے۔ میری طرح وہ بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہمارے گاؤں سے تیرہ میل دُور رہتے ہیں۔ ان کی اپنی شکاری پارٹی ہُوا کرتی تھی۔ جوانی میں اُن پر میرے والا خبط سوار تھا۔ کبھی کبھی اُن سے ملاقات ہُوا کرتی تھی۔ تین بار ہم اکٹھے شکار پر گئے تھے۔ عام طور پر وہ الگ شکار کھیلتے تھے اور ہم الگ۔

جب میری پہلی کہانی شائع ہوئی تو میں راجہ صاحب کے گاؤں گیا اور انہیں پرچہ دکھایا۔ انہوں نے میری کہانی بہت شوق سے اور دلچسپی سے پڑھی۔ پڑھ کر کہنے لگے "یار، تم نے تو بچپن کی یادیں تازہ کر کے مجھے یہ احساس دلا دیا ہے کہ اب ہم بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی ان یادوں کو تازہ کروں۔ لیکن لکھے کون؟ بیٹے کے نام خط لکھنا

پڑتا ہے تو مصیبت بن جاتی ہے۔"

راجہ صاحب آٹھ جماعتیں پاس ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ اپنی شکاری زندگی کا کوئی واقعہ سنا دیں، میں لکھوں گا۔ انہوں نے ذرا سا سوچا اور بولے "تم جانتے ہو کہ کُتوں کے شکار پر جب بھی نکلتے تھے تو کوئی نہ کوئی واقعہ ہو ہی جاتا تھا۔۔۔ ایک واقعہ ایسا ہے جو میں ضرور سناؤں گا۔ تم خود ہی لکھ لینا۔"

ہم دو بوڑھے ایک دن اور ایک رات کے لیے جوان ہو گئے اور شیر خان راجہ نے ایک واقعہ سنا دیا۔ یہ انہی کی زبانی سُن لیجئے۔ تحریر میری ہے کہانی راجہ صاحب کی ہے۔

صابر حسین راجپوت نے شکار کی باتیں سناتے سناتے محبت کے بھی ایک دو قصّے سُنا دیے ہیں جو پڑھ کر مجھے بھی اپنی جوانی یاد آ گئی ہے۔ میں نے بھی اپنی جوانی کُتے پالنے اور پوٹھوہار کے کھڈ نالوں میں گیدڑوں، خرگوشوں، سیہوں اور گوہوں کے پیچھے بھاگتے گذاری ہے۔ اپنے گاؤں سے دو میل دُور ایک بڑا گاؤں ہے جہاں مڈل سکول ہُوا کرتا تھا۔ اب تو ہائی ہو گیا ہے۔ میں نے وہاں سے آٹھ جماعتیں پاس کر لی تھیں کہ کوئی یہ نہ کہے کہ راجپوتوں کا بیٹا ان پڑھ ہے۔ نوکری کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ باپ دادا کی زمین بہت تھی۔ اسے سنبھالنے کے لیے مجھے گھر ہی رہنا تھا۔ گاؤں والوں کو میری آٹھ جماعت تعلیم کا یہ فائدہ ضرور ہُوا کہ گاؤں کے بہت سے جوان فوج میں تھے۔ ان کے خط آتے تھے تو ان کے گھر والوں کو پڑھ کر سنا دیا کرتا تھا اور ان کے جواب بھی لکھ دیا کرتا تھا۔ گاؤں والے تو مجھے تعلیم یافتہ سمجھ کر عزت کرتے تھے لیکن آپ میری کوئی عزت نہیں کریں گے کیونکہ یہ کہانی اپنے دوست صابر حسین راجپوت سے لکھوا رہا ہوں۔

کُتوں کا شکار جس طرح کھیلا جاتا ہے وہ تو آپ صابر حسین سے سُن چکے ہیں۔ بالکل

اسی طرح میں بھی شکار کھیلا کرتا تھا۔ وہی گیدڑ، وہی خرگوش اور وہی خطرے جنہیں آج بڑھاپے میں یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر صاحب! افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زمانے نے ایسا رنگ بدلا ہے کہ نئی نسل کی زندگی میں ہمارے دنوں والی رونق نہیں رہی کیونکہ زندگی میں اب خطرے نہیں رہے یا شاید ہمارے بچوں نے خطروں سے ہٹ کر نئی راہیں بنالی ہیں۔ کہاں ہم کہ دس دس میل کتوں کے ساتھ سرپٹ بھاگا کرتے تھے اور کہاں ہمارے بچے جو کھیتوں میں کھڑے لڑکیوں کو گھورتے رہتے ہیں یا گھروں میں ان کے ٹرانسسٹر فلمی گانے سناتے رہتے ہیں۔ ماحول پر خوست سی طاری رہتی ہے۔ قبرستان میں جنگِ ستمبر کے دو شہیدوں کی قبریں ہیں جنہیں گاؤں کا ہر گھرانہ اپنے بیٹوں کی قبریں سمجھتا ہے۔ ان قبروں کو دیکھ کر ہم اکثر ہندوستان کو گالیاں دیا کرتے ہیں اور دانت پیس کر کہتے ہیں کہ ہندو ایک بار پھر میدان میں آئے مگر گاؤں کے لونڈے جالندھر کے گانے سنتے رہتے ہیں اور ان گانوں کے ساتھ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا بھی بڑے شوق سے سنتے ہیں۔

کوئی لڑکی اپنے مشاغل کے کپڑوں یا اس کی زمین جائداد کی نہیں بلکہ اس کی مردانگی کی تعریفیں کیا کرتی تھی۔ دونوں عیدوں پر ہم کسی نہ کسی گاؤں کو گدرا اٹھانے یا کبڈی کھیلنے یا نیزہ بازی کے لیے بلایا کرتے تھے یا کسی گاؤں کے بلاوے پر جایا کرتے تھے۔ مائیں، بہنیں اور گاؤں کی لڑکیاں سہ سو دعائیں دے کر رخصت کیا کرتی تھیں۔ ہار کے آئیں تو گاؤں کے بزرگ گالیاں دیتے تھے اور جیت کے آئیں تو سارا گاؤں جشن مناتا تھا۔

اب گاؤں میں ایک بھی گھوڑا نہیں رہا۔ چند ایک گدھیاں اور دو گدھے ہیں۔ وہ بھی کم بخت آوارہ ہیں۔ گھوڑے کی جگہ سکوٹر نے اور گدھی کی جگہ سائیکل نے لے لی ہے لیکن نوجوان کی مردانگی کو کیوں دیمک لگ گئی ہے؟

خیر، بات عشق و محبت اور مردانگی کی چل نکلی ہے تو میں آپ کو اور آج کل کے نوجوانوں کو ایسا ہی ایک قصہ سنا دیتا ہوں۔ آپ اسے آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں اور جگ بیتی بھی۔

ہمارے گاؤں کے قریب قریب تین اور چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ ہمارے اور ان تین گاؤں کے ملا جلا کے سولہ سترہ شکاری کتے تھے اور ہم دوست اکٹھے شکار کو نکلا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو کسی گیدڑ یا خرگوش کے تعاقب میں چار چار پانچ پانچ میل بھاگتے چلے جاتے تھے۔ ہمارے علاقے میں کہیں کہیں وسیع قدرتی تالاب یا جوہڑ بنے ہوئے ہیں جنہیں ہم پوٹھو ہاری زبان میں سَر کہتے ہیں۔ ان کے کناروں پر پرُ کے درخت اور پانی میں کنول کے پھول اور چوڑے پتے بہت خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ ان تالابوں میں مرغابیاں بہت ہوتی ہیں لیکن بندوق سے ماری ہوئی مرغابی کو پانی سے نکال لانا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ کنول کے پودے گنجان ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ پانی میں اُگنے والی لمبی گھاس ہوتی ہے۔ اگر کوئی تیراک پانی میں اُتر جائے تو کنول کے لمبے پودے اور گھاس اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے۔ ہزار ہاتھ پاؤں مارو، گھاس ٹانگوں کو جکڑتی چلی جاتی ہے۔ آدمی کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو پانی کی ان زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتا نہ کوئی اس کی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کی طرف رسّہ پھینکو تو بھی وہ یا ہر نہیں آسکتا۔ پانی گہرا ہوتا ہے۔ آخر وہ بدنصیب انسان کنارے پر کھڑے لوگوں کے سامنے ڈوب جاتا ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسے تین حادثے دیکھے ہیں۔ اگر میں الگ الگ بیان کرنے لگوں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے اور آپ خون کے آنسو روئیں گے۔ ذرا اس ماں کا تصور کیجیے جو تالاب کے کنارے کھڑی چیخ اور چلا رہی ہے اور اس کا نوجوان بیٹا اس سے بیس پچیس گز دور موت کے منہ میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ وہ رو تا نہیں، کسی کو مدد کے لیے

نہیں بلاتا، کوئی اس کی مدد کے لیے جا بھی نہیں سکتا۔ اسے اپنا انجام معلوم ہے مگر وہ مرد دل کی طرح مرنا چاہتا ہے اور مردوں کی طرح دم توڑتا اور کنول کے چوڑے چوڑے پتوں اور بڑے بڑے پھولوں کے نیچے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتا ہے۔

چالیس بیالیس سال گزر گئے ہیں۔ میں اس وقت سوا دو من کا پتھر اٹھا کر سر سے اوپر لے جا سکتا تھا۔ جسم میں بڑا ہی دم تھا۔ چاروں دیہات کے سارے ہی نوجوان میری ہی طرح تندرست اور توانا تھے۔ مہنہ زور بیل یا بھینس کو سینگوں سے پکڑ کر بے بس کر دینا ہمارا مشغلہ ہوتا تھا۔ ایک روز ہم دس بارہ نوجوان سولہ سترہ کتوں کو لے کے شکار کو نکلے اور چار میل دور نکل گئے۔ راستے میں کتوں سے دو گیدڑ مروائے پھر ایک خرگوش کتوں کی نذر ہو گیا۔ کتوں کو بھوک لگ رہی تھی۔ خرگوش کی ایک ایک بوٹی ان کے حصے میں آئی تھی۔ گیدڑ کا گوشت ان کے مطلب کا نہیں تھا کیونکہ گیدڑ کا گوشت نمکین ہوتا ہے۔ کتا اسے نہیں کھا سکتا۔ ان کے لیے ہمیں خرگوشوں کی ضرورت تھی۔

قریب ہی ایک جھاڑی سے دو خرگوش نکل کے ہوا ہو گئے۔ وہ ذرا سی دور تک جھاڑیوں میں بھاگتے نظر آتے۔ ہمارے دو تازی کتوں نے انہیں زیادہ بھاگنے نہ دیا اور ڈیڑھ دو فرلانگ تک انہیں دبوچ لیا۔ تمام کتے پہنچ گئے اور ہمارے پہنچنے تک خرگوشوں کا بال بھی کہیں نظر نہ آیا۔ کتے ابھی بھوکے تھے۔ وہ سب بے تابی سے جھاڑیوں اور کھوہوں میں گھس رہے تھے۔ ان کے لیے مزید شکار کی تلاش میں ہم چلتے چلے گئے اور ایک تالاب (سمر) کے کنارے جا پہنچے۔ سارے کتے پانی پہ ٹوٹ پڑے۔ ہم بڑ کی گھنی چھاؤں تلے بیٹھ گئے اور کھانے کی تیاری کرنے لگے۔ دو تین لڑکوں کے پاس غلیلیں تھیں۔ کنارے سے کچھ تیس اندر دو تین مرغابیوں نے پانی سے سر نکالے اور ایک دوسری کے پیچھے تیرنے لگیں۔ ایک

لڑکے نے غلیل سے ایک غلیلہ مارا جو درمیان والی مرغابی کے سر پر لگا۔ باقی دو ڈبکی لگا گئیں اور زخمی مرغابی پانی میں پھڑپھڑانے لگی۔

میرے گاؤں کا ایک خوبرو نوجوان شہباز خان اٹھا اور اپنے کتے کو بلایا۔ دو تین لڑکوں نے بیک زبان کہا — "کتے کو پانی میں نہ اتارنا" — جہاں مرغابی پھڑپھڑا رہی تھی، وہاں کنول کے پودے اور گھاس خاصی گھنی تھی لیکن شہباز نے ہماری ایک نہ سنی اور اپنے کتے کو مرغابی دکھا کر کہا۔ "سجلی" — اس کے کتے کا نام سجلی تھا۔ اس کی ہر حرکت سجلی کی مانند تھی اور شکار پر سجلی کی طرح جھپٹتا تھا۔ شہباز نے پتھر پھینکا جو مرغابی کے قریب گرا اور اس کا بل تیر کر "سجلی" پتھر کے پیچھے پانی میں کود گیا۔ "سجلی" ایسا تیز تیرا کہ کم ہی کتے تیر سکتے ہیں۔ وہ پلک جھپکتے پھڑپھڑاتی مرغابی تک جا پہنچا مگر مرغابی ڈوب رہی تھی۔ پر پھیلا لینے کی وجہ سے وہ جلدی ڈوب بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر فوراً ڈوب جاتی تو ہماری شکاری ٹیم کا ایک نہایت تیز اور تجربہ کار کتا بچ جاتا اور میری اور شہباز کی زندگی کا ایک بہت بڑا حادثہ کبھی نہ ہوتا۔

"سجلی" مرغابی تک پہنچا تو زور سے بھونکا۔ اس کی تھوتھنی، آنکھیں اور سر کا ذرا سا حصہ پانی سے باہر نظر آ رہا تھا۔ وہ اس طرح بھونکا جیسے کسی جانور نے اسے کاٹ لیا ہو۔ ساتھ ہی وہ پانی سے ایسا اچھلا کہ اس کے کندھے تک نظر آ گئے لیکن پانی میں گرا تو اس کی تھوتھنی بھی ڈوب گئی۔ ہم نے پانی پر بلبلے بھی دیکھے جس سے شک ہوا کہ "سجلی" کے منہ میں پانی چلا گیا ہے۔ وہ پھر ابھرا اور بہت زور سے بھونکا۔ اتنے میں مرغابی ایک بار پھر پھڑپھڑاتی اور بے جان سی ہو کر ڈوبنے لگی مگر ہمیں یقین ہو گیا کہ "سجلی" بھی ڈوب رہا ہے اور وہ پانی کی ہری ہری زنجیروں میں جکڑا گیا ہے۔

اب تو اس کی جدوجہد صاف نظر آ رہی تھی۔ ہم کنارے پہ دم بخود کھڑے تھے اور شہباز

"بجلی، بجلی ـــــ نکل آؤ" پکار رہا تھا۔ "بجلی" ایسے طریقے سے بھونک رہا تھا جسے دوسرے کتوں نے خطرے یا شکار کا اشارہ سمجھا۔ تمام کتے پانی میں کود جانے کو بیتاب ہونے لگے۔ وہ کنارے پر ادھر اُدھر دوڑ اور بھونک رہے تھے۔ "بجلی" ان کی ٹیم کا نہایت اچھا ساتھی تھا کتے اسے اس مصیبت سے نکالنا چاہتے تھے۔ جانے کس نے کہا۔ کتوں کو پکڑ لو، پانی میں نہ چلے جائیں۔ ہم نے کتوں کے کالروں میں زنجیریں ڈال دیں اور جن کی زنجیریں نہیں تھیں انہیں پکڑ لیا۔

"بجلی" کنول اور آبی گھاس کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ وہ بہت ہی زور سے بھونک اور غرا کر پانی سے اُبھرتا تھا مگر پانی میں چھپے ہوئے رسیوں جیسے پودے جو اس کی ٹانگوں کے گرد لپٹ چکے تھے اسے کھینچ کر پانی میں واپس لے جاتے تھے۔ تالاب سے سو ڈیڑھ سو گز دور چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جو آج بھی سینے میں ایک دردناک کہانی چھپائے آباد ہے۔ اُس وقت جو ننھے ننھے بچے تھے وہ آج بچوں والے ہو گئے ہیں۔ انہیں تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ ایک "بجلی" کے پیچھے کیسی کیسی بجلیاں کوند گئی تھیں۔

اس گاؤں کے کئی ایک محسن لڑکے اور چند ایک نوجوان بھی اتنے سارے کتوں اور شکاریوں کو دیکھ کر تالاب کے کنارے آن پہنچے۔ "بجلی" کا انجام صاف نظر آ رہا تھا لیکن اس انجام کو برداشت کرنے کی ہمت ہم میں سے کسی میں بھی نہیں تھی۔ گاؤں کے ایک آدمی نے کہا بھی کہ لڑکو کتے کو چھڑانے کے لیے پانی میں نہ اتر جانا۔ شہباز اب باہر کی آوازوں سے رشتہ توڑ چکا تھا۔ اس نے کپڑوں سمیت پانی میں چھلانگ لگا دی اور اپنے پیارے کتے کو موت کے مُنہ سے نکالنے کے لیے موت کی طرف تیرنے لگا۔ ہم سب نے چیخ چیخ کر اسے پکارا ـــ "باز واپس آجاؤ، باز آگے نہ جانا۔ باز... باز" ـــ مگر وہ کتے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے جسم

کو زور سے آگے کو جھٹکا دیا لیکن میں نے صاف دیکھا کہ وہ آگے ہو کر اتنا ہی پیچھے کو آ گیا۔ اس نے ایک اور جھٹکا دیا مگر پھر پیچھے کو کھچا آیا۔

گاؤں کے ایک آدمی نے گھبرا کر کہا ـــ "رسّہ لاؤ، لڑکا گیا"۔ اور گاؤں کے تین چار لڑکے اور دو تین آدمی گاؤں کی طرف سرپٹ بھاگ اٹھے۔ ایک بڑی عمر کے آدمی نے ہمیں کہا۔ "کوئی لڑکا پانی میں نہ چلا جائے" ـــ اُدھر "بجلی" موت سے لڑ جھگڑ کر تھک چکا تھا اور اس سے چار پانچ گز دور شہباز اپنی ٹانگوں کو پانی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میں اس منظر کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا جب کہ ہمارا ایک عزیز دوست موت کے جبڑوں میں جکڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔ ہمیں کنارے پر کھڑے شرم محسوس ہو رہی تھی کہ اپنے دوست کی موت کا تماشا دیکھ رہے تھے لیکن گاؤں کے لوگ ہمیں آگے نہیں جانے دے رہے تھے۔

چند منٹوں میں گاؤں کے آدمی ایک رسّہ اور لمبے لمبے بانس اٹھائے بھاگے آئے۔ انہوں نے رسّے کا اگلا سرا ایک موٹے ڈنڈے کے درمیان میں باندھ کر ڈنڈے کو اتنی زور سے پھینکا کہ ڈنڈا شہباز کے قریب جا گرا۔ رسّے کا دوسرا سرا کنارے پر تھا۔ کسی نے بلند آواز سے کہا ـــ "ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لو" ـــ شہباز نے ڈنڈے کو پکڑ لیا تو اُدھر سے کئی آدمی رسّہ کھینچنے لگے۔ شہباز بھی کھچا اور ہم خوش ہوئے کہ وہ آزاد ہو گیا ہے مگر اس نے چلّا کر اور درد سے بے حال ہو کر کہا ـــ "مت کھینچو، ٹانگیں ٹوٹ رہی ہیں"۔

وہ بُری طرح جکڑا گیا تھا۔ اس نے ڈبکی لگائی۔ وہ شاید ایک ہاتھ میں ڈنڈا تھامے اور دوسرے ہاتھ سے ٹانگوں کے گرد لپٹی ہوئی گھاس کو کھولنا چاہتا تھا مگر کھول نہ سکا۔

ایک آدمی نے اسے کہا ــــ "میں بانس پھینکتا ہوں۔ اسے پانی کی تہ میں رکھ کر اس کے سہارے پانی سے اُوپر رہو" ــــ اس آدمی نے زور سے بانس پھینکا جو شہباز کے قریب گرا۔ اس نے فوراً پکڑ لیا۔

شہباز نے کہا "چھری یا چاقو پھینکو۔ میں ٹانگیں چیر ڈالوں گا" ــــ ایک آدمی دوڑا گیا اور لمبا سا چاقو لا کر شاہباز کی طرف پھینکا مگر وہ چاقو پکڑ نہ سکا۔ چاقو پانی میں ڈوب گیا۔ سارا گاؤں سر کے گرد جمع ہو گیا مگر شاہباز کی مدد کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اُس نے گھوم کر "بجلی" کو دیکھا جو اب نہایت خاموشی سے ڈوب رہا تھا۔ شہباز بڑی دردناک آواز میں چلایا "بجلی کہاں ہو؟" ــــ اس نے جب اپنے وفادار کتے کو ڈوبتے دیکھا تو رسّے والا ڈنڈا چھوڑ دیا اور بانس جس کے سہارے اسے خود پانی میں کھڑا ہونا تھا، "بجلی" کی طرف بڑھا دیا۔ کتے نے صرف ایک بار بانس پکڑنے کی کوشش کی لیکن شہباز کی ہتھوڑی ٹانگوں سے تیر نہیں سکتا تھا۔ وہ پانی میں ڈوبنے لگا۔ اُس نے اُبھرنے کی کوشش کی تو کتا ہمیشہ کے لیے پانی میں غائب ہو گیا۔

شہباز اب بھی "بجلی بجلی" پکار رہا تھا۔ اُس کی خاطر اس نے رسہ بھی چھوڑ دیا تھا اور جب دیکھا کہ "بجلی" ڈوب گیا ہے تو اس نے بانس بھی پھینک دیا جو پانی میں ڈوب گیا۔ یہی رسّہ اس کی زندگی اور موت کے درمیان حائل تھا یا وہ بانس تھا جو اسے موت کے خلاف سہارا دے سکتا تھا۔ اُس نے دونوں کو پانی میں ڈبو دیا اور اُس طرف لپکا، جہاں "بجلی" پانی میں غائب ہو گیا تھا لیکن وہ ایک ہی جگہ جکڑا ہوا بیکار زور لگا رہا۔

ہو سکتا ہے کہ بعض قارئین کو یقین نہ آئے کہ ایک انسان ایک کتے کی خاطر ڈوب سکتا ہے لیکن کتے ہمارے لیے جو وفاداری کرتے تھے اس کے لیے وہ ہماری خاطر جانیں خطرے

میں ڈال دیا کرتے تھے۔ بھیڑیے کے مقابلے میں کتے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اپنے مالک کی جان بچانے کی خاطر ہمارا اکیلا کتا دو دو، تین تین بھیڑیوں سے لڑ جاتا تھا۔ "بجلی" تو ایسا کتا تھا جس نے دو موقعوں پر شاہباز کی جان بچائی تھی۔ ایک بار ایک بدمست بھینسے نے ہمارے گاؤں میں اُودھم مچا دیا۔ اس نے دو دو دھ دینے والی بکریوں کو سینگوں سے چیر پھاڑ کر کچل دیا۔

ڈر تھا کہ کسی کے گھر میں داخل نہ ہو جائے۔ ہم نوجوان لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کے باہر نکل آئے اور بھینسے کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگے مگر بھینسا بدمست تھا اور طاقتور بھی۔ اس نے ہم پر حملہ کیا تو شاہباز اس کے آگے آ گیا۔ وہ اُس گلی کی طرف بھاگا جو آگے سے بند تھی۔ شاہباز گلی میں داخل ہو گیا۔ جب گلی کو آگے سے بند دیکھ کر پیچھے کو مڑا تو بھینسا بھی دوڑتا اور پھنکارتا ہوا گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ شاہباز کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جو بھینسے کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ ہم دُور چلے گئے تھے۔ کسی نے بتایا کہ شاہباز بند گلی میں پھنس گیا ہے تو ہم بھینسے کے پیچھے بھاگے مگر بھینسا شاہباز سے تھوڑی ہی دُور رہ گیا تھا۔

اُس وقت جب شاہباز کی موت اس کے سر پر پہنچ گئی تھی اُس کا یہی کتا "بجلی" بجلی کی طرح بھینسے کے پیچھے سے آیا اور چھلانگ لگا کر بھینسے کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اس نے بھینسے کی گردن میں دانت گاڑھ دیئے۔ بھینسا رُک گیا اور وہیں سے گھوم کر کتے کو اپنے اوپر سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔ "بجلی" اس کی گردن سے خون نکال رہا تھا۔ ہم نے ایک رسّہ اس کے سینگوں میں ڈال کر اسے بے بس کر دیا۔ اور "بجلی" نے صرف شاہباز کو ہی نہیں، گاؤں بھر کو بدمست بھینسے سے بچا لیا۔

اور "وہ بجلی" ہی تھا جس نے ایک بار شہباز کو قتل ہونے سے بچا لیا تھا۔ خاندانی عداوت اور پرانی دشمنیاں تو ہمارے علاقے کی ایک رسم ہے جو اُس زمانے کی طرح آج بھی موجود ہے۔ ایسی ہی ایک پرانی دشمنی شاہباز کی بھی چل رہی تھی۔ ایک رات دو آدمی اسے اُس وقت قتل کرنے آئے تھے جب وہ کوٹھے پر اکیلا سویا ہوا تھا۔ "بجلی" کو رات کے وقت کھلا رکھا جاتا تھا۔ بالکل اُس وقت جب شاہباز کا سر کلہاڑیوں سے کھلنے والا تھا۔ "بجلی" دشمنوں کی مشک پر کوٹھے پر بجلی کی طرح پہنچا اور ایک آدمی پر اس طرح حملہ کیا کہ اس کے راستے میں شاہباز کی چارپائی تھی۔ کتا چارپائی سے بھی آگے نکل گیا اور جس آدمی نے کلہاڑی بلند کر لی تھی۔ اس پر جھپٹا مار کر اس کا منہ نوچ لیا۔ وہ آدمی پیچھے کو گرا۔ شاہباز کی آنکھ کھل گئی۔ دوسرا آدمی بھاگ گیا لیکن "بجلی" نے ایک آدمی کو بھاگنے نہ دیا۔

شہباز نے یہ عقل مندی کی کہ اس آدمی کو جو گھر آیا دشمن تھا، قتل کرنے کی بجائے اسے باندھ لیا اور گھر میں قید کر کے اس نے اور اس کے باپ نے گاؤں کے بزرگوں اور اس آدمی کے گھر والوں کو اکٹھا کر لیا۔ سب کو بتایا گیا کہ یہ دو آدمی سوئے ہوئے آدمی کو قتل کرنے آئے تھے۔ ان میں اتنی مردانگی ہوتی تو سامنے آ کر مقابلہ کرتے۔ بزرگوں نے انہیں بہت شرمسار کیا اور مخالف خاندان نے شرم کے مارے قرآن کی قسم کھائی کہ آج سے انہوں نے دل سے دشمنی نکال دی ہے۔

آج وہ کتا شاہباز کی نظروں کے سامنے ڈوب گیا تھا۔ اس نے کتے کے ساتھ ہی مرجانا پسند کیا اور زندہ رہنے کے جو سہارے تھے وہ اس نے چھوڑ دیے۔ ہم بہت پریشان تھے کہ یا خدا، کیا کریں۔

گاؤں کے آدمیوں نے رسّہ کھینچا تو رسّہ بھی زیرِ آب گھاس میں اُلجھ گیا۔ یقین کیجیے کہ

پہلے چار آدمیوں نے پوری طاقت سے رسّہ کھینچا تو ایک انچ بھی نہ کھینچ سکے۔ شہباز کو بچانے کی یہی ایک صورت تھی جو بالکل غیر یقینی تھی۔ وہ اب پانی میں جا رہا تھا۔ دراصل رسّے سے بندھا ہوا ڈنڈا گھاس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ آخر آٹھ آدمیوں نے مل کر رسّہ کشی شروع کی پھر ہم میں سے تین چار نوجوان ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سب نے مل کر زور جو لگایا تو محسوس ہوا کہ رسّہ کھنچ رہا تھا۔ مسلسل جھٹکے دیتے ہم رسّے کو تین چار گز کھینچ لائے مگر ہمارے ساتھی چلائے۔ "باز ڈوب رہا ہے" — ہم اور تیزی سے رسّہ کھینچنے لگے۔ کسی نے کہا "گاؤں سے ایک اور رسّہ لاؤ، لڑکا ڈوب رہا ہے"۔ گاؤں کے لڑکے گاؤں کو بھاگے اور ہم نے اسی رسّے کو نکالنے کی کوشش جاری رکھی لیکن شہباز پانی میں ڈوب چکا تھا۔

اب تو لمحوں اور سانسوں کی بات تھی۔ اچانک رسّہ آزاد ہو گیا اور ہم سب آگے کو ایک دوسرے پر گرے۔ کسی نے چلّا کر کہا — "وہ رسّے کے ساتھ آ گیا ہے" — ہم نے دیکھا کہ شہباز رسّے کے ساتھ آ رہا تھا لیکن اس کا منہ بمشکل پانی سے باہر تھا۔ ویسے اس کی حالت لاش کی سی تھی۔ گاؤں کے دو آدمیوں کے پاس درانتیاں تھیں جو شاید وہ اسی مقصد کے لیے ساتھ لاتے تھے۔ وہ کپڑوں سمیت پانی میں کود گئے اور نہایت تیز تیرتے ہوئے شہباز تک پہنچے۔ وہ اب خطرناک علاقے سے نکل آیا تھا لیکن وہ زندہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت دیر پانی کے اندر رہا تھا۔

درانتیوں والے آدمیوں نے شہباز کے قریب ڈبکیاں لگائیں۔ کوئی دو منٹ بعد ابھرے تو ان کے ہاتھوں میں رسیوں جیسی ڈالیاں تھیں۔ وہ پھر ڈبکی لگا گئے اور جب ابھرے تو انہوں نے شہباز کو درمیان میں کر کے ایک ایک ہاتھ کا اسے سہارا دیا اور ٹانگوں اور ایک بازو سے تیرتے کنارے کی طرف آنے لگے۔ جب کم گہرے پانی میں آتے تو پاؤں پہ

کھڑے ہو گئے اور انہوں نے شاہباز کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔ تب ہم نے دیکھا کہ یہ معجزہ کس طرح رونما ہوا ہے۔ رسّے کے ساتھ بندھا ہوا لنگر اس گھاس اور پودوں کے ساتھ نیچے جا کر الجھ گیا تھا جنہوں نے شاہباز کو جکڑ رکھا تھا۔ ادھر سے آٹھ دس آدمیوں نے پوری طاقت سے جھٹکے دیے تو وہ تمام پودے جڑوں سے اکھڑ گئے۔ ہم نے پودوں کو تو اکھاڑ لیا لیکن شہباز کو ڈبو دیا۔ وہ ان پودوں کے ساتھ کچھ ہوا پانی میں چلا گیا تھا۔

جب وہ کم خطرناک حصے میں آیا تو کچھ اور پودے اس کی ٹانگوں سے الجھ گئے۔ گاؤں والے کو معلوم تھا کہ اس جگہ پودے گھنے نہیں ہیں۔ ڑبکیاں لگا کر انہوں نے پودوں اور گھاس کو درانتیوں سے کاٹ دیا اور شاہباز کو پانی سے اٹھا لائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں نے آسانی سے سنا دیا ہے۔ گاؤں کے ان دو آدمیوں نے شاہباز کو بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ پانی میں ڈبکی لگا کر اس کی ٹانگوں کو گھاس اور پودوں سے آزاد کرتے کرتے وہ خود بھی اسی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

شہباز بے ہوش تھا۔ اس کی ٹانگیں جگہ جگہ سے کٹ گئی تھیں۔ پیٹ اور کمر سے بھی کھال اُتر گئی تھی اور اس کا پیٹ پانی سے بھر گیا تھا۔ اسے زمین پر اوندھے منہ لٹا کر پیٹھ دبائی گئی تو اس کے پیٹ سے کم و بیش ایک گیلن پانی نکلا۔ گاؤں والے اسے چارپائی پر لٹا کر گاؤں کے ایک گھر میں لے گئے۔ ہم نے انہیں کہا کہ ہم اسے چارپائی پر اپنے گاؤں لے جائیں گے لیکن گاؤں والوں نے قدرے غصے سے کہا — "ہم میں ابھی غیرت ہے بچّو! جو کوئی اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے رہ جائے باقی سب چلے جاؤ۔ اور اس کے گھر اطلاع دے دو۔ ہم اسے تندرست ہونے تک نہیں جانے دیں گے" — میں رُک گیا۔ اور باقی سب کو گاؤں بھیج دیا۔ شام کو شہباز کے والد صاحب اور والدہ آ گئیں۔ انہیں بھی گاؤں والوں نے یہی کہا۔

کہ وہ اسے تندرست کر کے بھیجیں گے۔ کیونکہ وہ ان کے سر (تالاب) میں زخمی ہوا ہے۔

اُس کے والدین مجبور ہو گئے۔ یہ اُس زمانے کا رواج تھا کہ مریض مہمان کو صحت یاب ہونے تک رخصت نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ یہاں تک ہوتا تھا کہ کوئی راہ جاتا آدمی کسی گاؤں کے قریب سے گزرتے بیمار یا زخمی ہو جاتا تو اسے گاؤں کے کسی گھر میں رکھ لیا جاتا اور صحت یاب کر کے رخصت کیا جاتا تھا۔ آج کے دور میں وہ پیار اور خلوص ختم ہو چکا ہے۔ شاہباز کے والد صاحب ایک روز رہ کر واپس چلے گئے۔ اس کی والدہ صاحبہ تین چار روز بعد چلی گئیں۔ ان کے اصرار کے باوجود میزبانوں نے شاہباز کو نہ جانے دیا۔ میں اس کے ساتھ رہ گیا۔

شاہباز کو جب ہوش آیا تھا تو اس نے پہلی بات یہ پوچھی تھی — "سجلی کہاں ہے"؟ — صرف میں جانتا تھا کہ اسے جب پتہ چلے گا کہ "سجلی" ڈوب گیا ہے تو اس کا کیا حال ہو گا۔ میں نے اسے جواب دیا تھا — "سجلی کا فکر نہ کرو یار، یہیں ہے۔ تم اپنی سناؤ" — وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا — "سجلی کو بلا دو۔ کہاں ہے سجلی؟ اسے دودھ دیا"؟

میں نے تیسرے دن جب اس کی صحت بہتر ہو گئی تھی، بتایا کہ "سجلی" ڈوب گیا ہے۔ شاہباز زور سے لیٹے لیٹے اُٹھا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر لٹا دیا۔ اس کی ذہنی حالت پھر خراب ہو گئی۔ وہ ضد کرنے لگا کہ میں سجلی کو ڈوبنے نہیں دوں گا۔ پھر وہ مجھے اور تمام دوستوں کو گالیاں دینے لگا۔ میں نے اسے بڑی ہی مشکل سے سمجھایا کہ سگے بھائی اور باپ مر جاتے ہیں۔ بچے بھی مر جاتے ہیں اور مرد یہ صدمہ برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر وہ "سجلی" کے مرنے کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بچوں کی طرح ہچکیاں لے لے

کر رونے لگا۔

خدا نے اس کے دل کو بہلانے کے لیے ایک اور ہی بندوبست کر دیا۔ اور یہ بندوبست خوفناک واقعہ بن گیا ـــــ اس گھر میں ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس لڑکی کے نقش بہت دلکش تو نہیں تھے لیکن خدا نے اسے آنکھیں ایسی دی تھیں کہ جو مرد اسے ایک بار دیکھتا تھا اس سے نظر نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہونٹ خدا نے ایسے بنائے تھے کہ وہ مسکراتی لگتی تھی۔ آنکھوں اور مسکراہٹ نے مل کر اسے ایسی خوب صورتی دی تھی کہ میں نے جب اسے دیکھا تو میں نے اپنے آپ میں بجلی کا جھٹکا محسوس کیا تھا۔ وہ ہنس مکھ تھی اور شرمانے کی بجائے کھل کر باتیں کرتی تھی۔ شہباز کو دودھ دہی کھانا وغیرہ یہی لڑکی دیا کرتی تھی۔ اس نے شہباز کو اپنے کتے کے لیے روتے ہوئے دیکھا تھا اور اس نے شہباز کو اس کتے کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

شہباز کی حالت سنبھل گئی تو میں اکثر باہر نکل جایا کرتا تھا۔ گھر کے آدمی بھی کھیتوں وغیرہ کو چلے جاتے تھے۔ گھر میں یہ لڑکی رہ جاتی تھی۔ ایک رات شہباز نے مجھے کہا کہ وہ مجھے راز کی بات بتانا چاہتا ہے اور اگر یہ گناہ ہے تو اسے بتا دے۔ میرا دھیان فوراً لڑکی کی طرف چلا گیا اور بات واقعی لڑکی کے متعلق تھی۔ اس نے کہا ـــ "تین چار دن ہوئے لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کتے سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ اس کے پیچھے اپنی جان قربان کرنے کو سر میں کود گئے تھے؟ میں نے اسے کہا کہ ہاں، میں مرد ہوں۔ محبت کی خاطر جان دے سکتا ہوں ـــ وہ میرے ساتھ باتیں کرنے لگی اور بولتے بولتے اس کا لہجہ بدل گیا۔ مجھ سے اس نے پوچھا کہ اگر کتے کی جگہ میں ہوتی تو

تم میرے پیچھے بھی اسی طرح کود جاتے؟ میں نے ہنس کر کہا کہ چلو، میرے کتے کی طرح سر میں کود دو پھر دیکھنا میں تمہارے پیچھے آتا ہوں یا نہیں۔"

شہباز نے مجھے بتایا "میں تو ہنس پڑا لیکن لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی کہ میرے پیچھے آگ میں بھی کود جاؤ گے؟ ـــ مجھ پر اس لڑکی اور اس کے ماں باپ کا بہت بڑا احسان تھا۔ میں نے اسے کہا کہ سنو میری بہن، میں تمہارے لیے آگ میں بھی کود جاؤں گا ـــ اس نے کہا کہ مجھے بہن نہ کہو۔ میں تمہیں بھائی نہیں بنانا چاہتی۔ میں نے پوچھا کہ پھر کیا کہوں تمہیں؟ ـــ اس نے کہا کہ میرا نام فاطمہ ہے ـــ اس طرح کی باتیں کرتے کرتے اس نے دل کی بات صاف صاف کہہ دی۔ کہنے لگی کہ مجھے بے شرم کہو یا جو منہ میں آئے کہہ لو۔ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ میں تم جیسے ایک مرد کے انتظار میں تھی۔ خدا نے مجھے اشارہ دیا ہے کہ تم میرے لیے آگ میں کود جاؤ گے اور میں تمہارے لیے اپنا کلیجہ نکال کر بھیڑیوں کے آگے پھینک دوں گی۔ قرآن کا قول دو کہ مردوں کی طرح میرا ساتھ دو گے ـــ میں نے قول دے دیا۔"

یہ کہہ کر شہباز نے مجھ سے پوچھا ـــ "میں گناہ تو نہیں کر رہا؟ یہ میرے محسنوں کی بیٹی ہے۔ اللہ کی قسم، میری نیت بری نہیں" ـــ میں نے اسے بتایا کہ تم اس کے ساتھ شادی تو کر نہیں سکو گے کیوں کہ ان کی ذات اور ہے اور تمہاری اور۔ اگر تم ٹھیک ہو کر بھی اس سے ملتے رہے تو ایک دن نہ ایک دن تمہاری نیت ضرور خراب ہو جائے گی۔ میں تو اسے گناہ سمجھتا ہوں۔

اس نے ایک اور ہی قصہ سنا دیا۔ اس نے کہا ـــ "لڑکی نے مجھ سے قرآن کا قول لیا ہے کہ میں اس کے پیچھے آگ میں کود جاؤں گا۔ یہ قول لے کر لڑکی نے مجھے بتایا کہ

شاہ جی اس کے ماں باپ سے اس کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ لڑکی کو یہ رشتہ منظور نہیں کیونکہ شاہ جی کی پہلے ہی تین بیویاں ہیں اور ان کی عمر پچاس سال سے بہت اُوپر ہے۔"

یہ اس علاقے کا ایک مشہور پیر تھا جو ہر ایک پیر کی طرح لوگوں پر چھایا ہُوا تھا اور پیری کے پردے میں بدکاری کرتا اور خوب عیش کرتا تھا۔ اب یہ لڑکی جوان ہوئی تو اس کی مستانی آنکھوں اور جادو بھرے ہونٹوں نے شاہ جی کا دل موہ لیا اور اسے باقاعدہ بیوی بنانے کے لیے تیار ہوگیا۔ گاؤں کے بزرگوں نے بھی لڑکی کے والدین پر زور دیا کہ وہ لڑکی کو شاہ جی سے بیاہ دیں۔ اس سے بڑی اور خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے۔ والدین بھی آخر اسی دیہاتی برادری کے افراد تھے جو پیروں کو خدا مانتے تھے۔ انہوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ابھی دن مقرر نہیں ہوتے تھے لیکن لڑکی کو پتہ چلا تو اس کی نگاہ میں پیر کی حیثیت بدل گئی۔ وہ پیر کی بجائے ایک عام آدمی بن گیا جس کی پہلے ہی تین بیویاں تھیں۔ وہ اب کسی ایسے آدمی کا انتظار کر رہی تھی جو اصل مرد ہو اور مردوں کی طرح اس کا ساتھ دے۔ شہباز میں اسے مردانگی نظر آئی تو اسے اپنے دل کا حال سنا دیا۔ شہباز مردوں کی طرح اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ احسان کی قیمت ادا کرنے کے لیے جان کی بازی لگانے پر بھی تیار تھا۔

"میں نے یہ جانتے ہوئے کہ اگر وہ پکڑے گئے تو قتل کر دیے جائیں گے، شہباز کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ اسے یہ کہا کہ اگر اسے میری ضرورت پڑے تو میں ہر طرح مدد کروں گا۔

سولہویں روز شہباز صحت یاب ہو کر اپنے گاؤں کو روانہ ہُوا۔ میں ساتھ تھا۔ میں نے لڑکی کی لال سرخ آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ بڑی ہی مشکل سے آنسوؤں کو آنکھوں میں

روکے ہوئے تھی۔ شہباز مرد تھا اور سب سے ہنس ہنس کر مل رہا تھا مگر راستے میں میرے ساتھ باتیں کرتے اس کے آنسو نکل آتے۔

یہ گاؤں ہمارے گاؤں سے آٹھ دس میل دُور تھا۔ شہباز ہر سات آٹھ روز بعد رات کے وقت پاپیادہ اس لڑکی سے ملنے کے لیے جانے لگا۔ وہ گاؤں سے ڈیڑھ ایک فرلانگ کہیں چھپ کر شہباز کی طرح چیختا تھا۔ لڑکی اس اشارے سے واقف تھی جو شہباز اس سے طے کر چکا تھا۔ وہ چوری چھپے پہنچ جاتی تھی لیکن ان کی ملاقات چند لمحوں کی ہوتی تھی۔ دو تین بار میں بھی اس کے ساتھ گیا۔

اسی طرح ان کی محبت پروان چڑھتی رہی اور دو مہینے گزر گئے۔ ایک روز وہ صبح ہی صبح میرے گھر آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ کہنے لگا کہ لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ تو ہونا ہی تھا اور ایسے ہی ہوتا آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر اس کی شادی کسی اور سے ہوتی تو وہ برداشت کر لیتا لیکن اسے شاہ جی بیاہ کے لے جا رہے ہیں۔ شہباز رات کو لڑکی سے مل آیا تھا۔ اسی نے اسے بتایا تھا کہ شاہ جی نکاح کا دن بھی مقرر کر گئے ہیں۔

یہ شاہ جی ہمارے علاقے کے پیر تھے۔ ہم بھی ان کے مرید تھے لیکن مریدی ختم ہوگئی۔ ہم نے جاسوسی شروع کر دی۔ شاہ جی کے گھر سے اطلاع ملی کہ وہ سب سے پہلی بیوی کو اس لڑکی کو بیاہ لانے کے لیے طلاق دے رہے ہیں۔ یہ بیوی تیس برسوں سے ان کی بیوی تھی۔ جب اس نے اپنی جوانی شاہ جی کے ڈیرے پر قربان کر دی تو وہ اسے طلاق دے رہے تھے۔ شاہ جی کو ایسے ارادوں سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ دیہاتیوں کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر چکا تھا کہ شاہ جی جو کچھ کرتے ہیں وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ خدا کے اشارے سے

کرتے ہیں۔ اُس وقت مَیں بھی اس بات کو برحق مانتا تھا لیکن اس لڑکی کے معاملے میں خدا نے شاہ جی کی بجائے مجھے اشارہ دے دیا کہ شاہ جی جو کہتے ہیں سراسر بکواس ہے اور خدا کسی بَ کو ایسا اشارہ کبھی نہیں دے گا کہ رستی بستی بیوی کو اجاڑ کر اس کی جگہ ایک نوجوان لڑ لے آئے۔

شہباز نے مجھے بتایا کہ شاہ جی نے جو دن مقرر کیا ہے اس کے مطابق شادی گیارہ روز ہوگی اور مَیں لڑکی کے ساتھ طے کر آیا ہوں کہ جمعرات کی رات رتین روز بعد) آدھ گا اور وہ گھر سے نکل آئے گی۔ لڑکی کو ساتھ لے آنا کوئی ایسا مشکل نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ شادی کسی پہلو ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ سارے علاقے کو علم ہو چکا تھا کہ وہ شاہ ج کی منگیتر بن چکی ہے۔ مَیں نے شہباز کو ان خطروں سے خبردار کیا تو اس نے پُرعزم لہجے میں کہا کہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ لڑکی کو گھر نہیں لائے گا بلکہ اسے گاؤں سے نکال کر دہیں سے لاہور چلا جائے گا۔ پھر کبھی اس طرف کا رُخ نہیں کرے گا۔

ہم اُس وقت نوجوان تھے۔ عقل کم تھی اور خون زیادہ جوش مارا کرتا تھا۔ شہباز نے کہا کہ اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ مَیں تیار ہو گیا۔ وہ میرا بہت ہی عزیز دوست تھا۔ ہم مقررہ رات لڑکی کے گاؤں کے اتنی قریب پہنچ گئے جہاں سے وہ آواز سُن سکتی تھی۔ ہمیں گھوڑے یا کم از کم ایک گھوڑا ساتھ لے جانا چاہیے تھا لیکن بزرگوں کے ڈر سے گھوڑے کو ذہن سے نکال دیا اور پیدل چلے گئے۔ میرے پاس کلہاڑی اور شہباز کے پاس لاٹھی تھی جس کے اگلے سرے میں دو سیر سیسہ بھرا ہُوا تھا اور اوپر پیتل کا خول چڑھا ہُوا تھا۔ اس لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے طاقت ور انسان بھی گر پڑتا ہے۔

رات چاندنی تھی اور چاندنی بڑی ہی شفاف۔ ہم گندم کے فصل میں چھپے رہے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق لڑکی کو پہلے چھت پر آنا تھا۔ پھر شہباز کو گیدڑ کی طرح بولنا تھا۔ مَیں نے اس گاؤں کو دیکھا تو کچھ افسوس سا بھی ہُوا کہ اسی گاؤں میں شہباز کو نئی زندگی ملی تھی اور اسی گاؤں کے لوگوں نے اسے موت کے منہ سے نکالا تھا مگر ہم یہاں چوروں کی طرح گاؤں کی ایک لڑکی کو اغوا کرنے آئے تھے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن شہباز اور لڑکی کی پاک محبت اور شاہ جی کی ہوس پرستی اور لڑکی کی بے بسی کا خیال آیا اور یہ خیال بھی آیا کہ یہ لڑکی شاہ جی کے گھر چلی جائے گی تو ایک سہاگن، خاوند کے جیتے جی بیوہ ہو جائے گی اور ایک جوان لڑکی کی جوانی تباہ ہو جائے گی تو میرا خون کھول اُٹھا اور اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ جرم نہیں نیکی ہے۔ شاہ جی کے خلاف ہم زبانی کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس علاقے میں خدا کے بعد پیروں کا درجہ اعلیٰ ہے اور انہی کی حکمرانی ہے۔ لڑکی کو بچانے کا یہی ایک طریقہ تھا جو ہم اختیار کر چکے تھے۔

گاؤں کے لوگ دن بھر کے تھکے ماندے شام کو ہی سو جاتے ہیں۔ سارا گاؤں غیر معمولی طور پر خاموش اور بے سُدھ تھا جیسے وہاں کوئی بھی زندہ نہیں تھا۔ پھر بھی ہم چھپے رہے اور چھپے رہے۔ شہباز بے چین تھا کیونکہ اسے چھت پر ابھی تک کوئی نظر نہیں آئی تھی۔ کہنے لگا کہ سو نہ گئی ہو۔ عین اس وقت گاؤں کی چھت پر کچھ ہلتا نظر آیا۔ شہباز نے گیدڑ کی طرح "آہو، آہو" کی تو لڑکی نے ہاتھ ہلایا اور وہ چھت سے غائب ہو گئی۔ ہمارے علاقے میں گیدڑ رات بھر چیختے رہتے ہیں۔ ان کی آواز پر کبھی کوئی چونکتا نہیں۔ بعض اوقات گیدڑ گاؤں کے قریب بھی آ جاتے ہیں۔ اس وقت کتے ان کے پیچھے دوڑتے ہیں اور گیدڑ بھاگ جاتے ہیں۔

شہباز نے جوش میں آکر پھر گیدڑوں کی آواز نکالی تو قریب ہی ایک کتا بڑی زور سے بھونکا۔ میں نے کتے کی آواز سے پہچان لیا کہ یہ رکھوالی والا کتا ہے جو کسی کی بُو پاکر خاص انداز سے بھونکتا ہے۔ گاؤں میں کوئی ایسی آواز سُن لے تو اسے نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ لاٹھی یا کلہاڑی لے کر باہر نکل آتا ہے۔ جوں ہی یہ کتا بھونکا، گاؤں سے کسی کی بلند آواز سنائی دی ــــ "شاباش بُولی! جانے نہ دینا" ــــ یہ آواز ہر گاؤں کی رات کی مخصوص آواز ہوتی ہے جو اکثر سنائی دیتی ہے۔ ہم اس آواز پر چوکنے ہو گئے۔ شہباز کے کہنے پر ہم فصل سے نکل کر ایک مینڈھ پر بیٹھ گئے۔ لڑکی گاؤں سے نکلتی نظر آئی۔ لیکن وہ ایک دیوار کے سائے میں ہو گئی۔ شہباز نے کہا ــــ "آ رہی ہے"۔

اچانک ایک طرف سے کتا نمودار ہوا اور ہمیں دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ ساتھ ہی آگے بڑھنے لگا۔ ہم کتوں کی نفسیات اور عادتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ہم جان گئے کہ کتا حملہ کرے نہ کرے وہ ہمیں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ وہ اب مسلسل غرّانے اور بھونکنے لگا۔ اِدھر گاؤں سے رات کی خاموشی میں ایک بلند آواز سنائی دی "اٹھ کے دیکھو ادے، کتا کیوں بھونک رہا ہے" ــــ اس کے ساتھ ہی آواز سنائی دی ــــ "ہلا بُولی، ہوشیار ہو کے" ــــ اس آواز پر "بُولی" اور ہوشیار ہو گیا اور ہم پر حملہ کرنے کو بڑھا۔ شہباز نے لاٹھی گھمائی تو کتا ایسے انداز سے غرّایا اور بھونکا جیسے ہم دیہات کے لوگ خطرے کا الارم سمجھتے ہیں۔

لاٹھی سے ڈر کر کتا پیچھے کو بھاگا۔ ہم نے گاؤں کی طرف دیکھا تو ہمیں لڑکی مڑتی ہوئی اپنی طرف آتی نظر آئی مگر اس کے پیچھے ہمیں چار آدمی لاٹھیاں وغیرہ اٹھائے ہوئے بھی بھاگتے دکھائی دیئے۔ ہم دونوں پورے گاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن جس دلیری سے لڑکی دوڑی آ رہی تھی وہ ہمیں جان پر کھیل جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ صرف ہم ہی جانتے تھے کہ لڑکی پچاس پچپن سالہ بوڑھے اور تین بیویوں کے خاوند سے بھاگ کر اس آدمی کی پناہ میں دوڑی آ رہی ہے جسے وہ دل و جان سے چاہتی ہے۔

اِدھر کتا پھر ہم پر لپکا۔ شہباز نے اتنا ہی کہا "دوست پیٹھیں جوڑ کر لڑیں گے" ــــ میں نے جواب دیا "جو مولا کرے گا۔ غم نہ کرو"۔ شہباز نے کتے کے سر پر لاٹھی ماری تو کتا بڑی ہی کرخت آواز نکال کر گرا اور تڑپنے لگا۔ ہمیں آواز سنائی دی ــــ "ہلا ڈبو" ــــ میرے بائیں طرف سے ایک اور کتا لپکا۔ یہ گاؤں والوں کا "ڈبو" تھا۔ نہایت اچھی نسل کا کتا تھا۔ میں اسے کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ وہ نڈر ہو کر پوری رفتار سے دوڑا آ رہا تھا۔ مجھ سے چار پانچ گز دُور سے اس نے ایسی جست لگائی جیسے ہوائی جہاز زمین سے اُٹھتا ہے۔ اگر وہ کتا مجھے اس صورتِ حال میں نہ ملتا تو میں اسے دو تین ایکڑ زمین کے عوض بھی خرید لیتا مگر وہ مجھے چیرنے پھاڑنے کے لیے ہوا میں بلند ہو چکا تھا اور اِدھر میری کلہاڑی ہوا میں تیار ہو چکی تھی۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ میرے بازوؤں نے پوری طاقت سے کلہاڑی کو ایسا گھمایا کہ کتے کی کھوپڑی کو دو حصوں میں کاٹتی میرے بائیں کندھے سے بھی آگے نکل گئی۔ کتا تڑپا اور بے حس ہو گیا۔

اُدھر سے لڑکی کی چیخ سنائی دی پھر لڑکی کی گالیاں سنائی دیں۔ گاؤں والے لڑکی کو رات کے اس وقت باہر دیکھ کر ساری بات سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے اسے دبوچ لیا تھا اور وہ چیخ چیخ کر انہیں گالیاں دے رہی تھی۔ دیہات کی ایک نوجوان اور پاک لڑکی پیروں کی دنیا میں بے بس اور مجبور تھی۔ ہم ابھی کتوں سے فارغ ہوتے تھے اور

اُدھر سارے ہی گاؤں کے مرد مسلح ہو کر نکل آئے تھے۔ ہم کھلے میدان میں تھے۔ ہر طرف کھیت اور کھڈنالے تھے۔ لڑکی پکڑی گئی تھی۔ ہم اب بھاگنا نہیں چاہتے تھے۔

شہباز نے پاگل سا ہو کر کہا۔ "شیرے! گاؤں میں خون کر کے نکلیں گے"

ہمیں چاندنی رات میں آوازیں ہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہر طرف للکار تھی "جانے نہ دینا۔ پیچھے سے روکو۔ زندہ پکڑو۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔۔۔ ہلا مردو! ہلا شیرو"۔

ہم دونوں موزوں جگہ کی تلاش میں ایک طرف کو ہو گئے لیکن گاؤں کے آٹھ دس آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ اس کے بعد مجھے لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کے ٹکرانے کی آوازیں یاد ہیں جو مرتے دم تک یاد رہیں گی۔ شہباز مجھے اور میں اسے پکار رہا تھا جس سے دونوں کا حوصلہ بلند رہا۔ میں نے کلہاڑی سیدھی نہیں چلائی بلکہ الٹی طرف سے مارتا رہا۔ کیونکہ میں کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کلہاڑی کے پھل کی الٹی طرف کی ضرب ہتھوڑے سے کم نہیں ہوتی۔ لیکن آدمی مرتا نہیں۔ بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ہم نے بہت لاٹھیاں کھائیں اور بہت ماریں اور میں نے چار آدمی گرتے ہوئے بھی دیکھے۔ جتنی چوٹیں میں نے کھائی تھیں وہ مجھے گرانے کے لیے کافی تھیں لیکن ہماری حیثیت چوروں کی سی تھی۔ ہمیں بچ کے نکلنا تھا اس لیے میں ابھی بے ہوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لڑتے لڑتے شہباز میرے قریب آ گیا اور میرے کہنے پر ہم لڑائی سے نکلنے لگے۔ شہباز بھی مان گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کتنی اور کیسی کیسی چوٹیں کھائی تھیں، اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اس کا دماغ صحیح ہو گیا ہے کیونکہ اب وہ عقل مندی کی باتیں کر رہا تھا۔

کہنے لگا۔ "شیرے نکلو"۔۔۔ اور ہم بھاگنے لگے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارا تعاقب کسی نے نہ کیا۔ شاید وہ لوگ ہماری ضربوں سے بے حال ہو چکے تھے۔ فصلوں کی اوٹ سے ہمیں آوازیں سنائی دیں جو صاف بتا رہی تھیں کہ ہم ابھی گھیرے میں ہیں۔ ہم نے راستہ بدل لیا۔ مگر آگے ایک اور گنا آ گیا۔ کم بخت اچھل کر آیا۔ آگے شہباز تھا۔ اس کی لاٹھی نے اسے کبھی نہ اٹھنے کے لیے گرا دیا اور ہم بھاگ اٹھے۔ چاروں طرف سے لوگ چلا رہے تھے "سنبھل کے بھائیو۔۔۔۔ ادھر ہیں۔۔۔۔ اُدھر ہیں"۔۔۔ ایک آواز یہ بھی سنائی دی "بڈھے صوبیدار کو جگاؤ یار، بندوق لے آئے"۔۔۔ یہ صورت بہت خوفناک تھی۔

ہم چھپتے چھپتے ایک طرف نکل گئے اور تیز دوڑنے لگے لیکن جسم شل ہو چکے تھے۔ زیادہ چوٹیں کندھوں پر پڑی تھیں جن سے کندھے سُن ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا علاقہ کچھ عجیب سا ہے۔ یوں پتہ چلتا ہے کہ جس میدان میں چلے جا رہے ہیں وہ دُور تک میدان ہی ہے لیکن اچانک میدان ختم ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہم مٹی کی ایک پہاڑی پر کھڑے ہیں۔ آگے گہرائی ہے پھر ایک میدان اس پہاڑی کے دامن سے شروع ہوتا ہے۔ زمین پتھریلی نہیں، مٹی ہی مٹی ہوتی ہے۔ ہم بھاگتے ہوتے ایسی ہی ایک جگہ پہنچ گئے۔ آگے کوئی ایک سو فٹ گہرائی تھی۔ نیچے دیکھا تو یہ ایک برساتی نالے کا خشک پاٹ تھا۔ ہمیں پیچھے سے اور دُور دُور سے بھی لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ گاؤں والے ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ تعاقب کر رہے ہیں۔

ہم نے نیچے دیکھا تو بیس پچیس فٹ نیچے ایسی فراخ جگہ دکھائی دی جہاں ہم کود سکتے تھے۔ دائیں بائیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ راستہ تو تھا لیکن وہ دوسرے لوگوں کے لیے تھا، چوروں کے لیے نہیں۔ ہم اب راستوں سے ہٹ کر بھاگنا چاہتے تھے کیونکہ خیریت اسی میں تھی

..... ہم نیچے کود گئے۔ وہ جگہ ریتلی تھی جس سے ہمیں کوئی چوٹ نہ آئی۔ وہاں سے ہم بیٹھے بیٹھے نیچے کو سرکے اور بڑے مزے سے نالے کے ریتلے پاٹ میں پہنچ گئے۔

اچانک آواز آئی "اِدھر ہیں۔ پہنچو، پہنچو" پیشتر اس کے کہ ہم سنبھلتے ہم پر لاٹھیوں کی بارش برسنے لگی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یہ آواز سنائی دی "جان سے نہ مارنا، زندہ پکڑو"

پھر چاندنی رات تاریک ہوگئی۔ آنکھوں کے سامنے کئی ستارے ٹوٹے اور دماغ سوگیا۔

ہوش آئی تو شہباز کو اپنے پہلو میں لیٹا ہُوا پایا لیکن ہم دونوں ایک ہی چارپائی پر رسیوں سے جکڑے ہوئے پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں کھلے تھے۔ رسیاں چارپائی کے ایک بازو سے دوسرے بازو تک تن دی گئی تھیں اور ہم اس جال میں بے بس تھے۔ مَیں نے شہباز کو سرگوشی میں پکارا تو اس نے اس طرح جواب دیا جیسے سسکی بھری ہو۔ جسم کا انگ انگ دُکھ رہا تھا اور سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ دماغ سوچنے سے معذور تھا۔ مَیں نے اپنے انجام کے متعلق کچھ بھی نہ سوچا۔ اتنی سکت نہیں تھی، نہ یہ معلوم تھا کہ یہ رات ہے یا دن ہے۔ ہم غالباً مولیشیوں کے کمرے میں قید تھے۔ دیوار کے ایک سوراخ میں مٹی کا دیا جل رہا تھا اور کمرہ بدبو سے بھرا ہُوا تھا۔ ہم دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ مل کر زور لگایا مگر رسیاں بہت مضبوط تھیں۔ دیا جلتا دیکھ کر معلوم ہُوا کہ رات ہے مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ کونسی رات ہے نہ یہ پتہ تھا کہ ہم کتنا عرصہ بے ہوش رہے۔ بہرحال یہ دیکھ کر اطمینان ہُوا کہ رات ہے اور یہ دراصل اس رات کا آخری پہر تھا۔

مَیں نے خدا کو یاد کیا اور دل ہی دل میں خدا سے کہا کہ یا اللہ، اگر ہم گناہ کرنے آئے تھے تو ہمیں پوری سزا دے اور اگر تیری ذات باری کو ایک لڑکی کی معصومیت اور بے بسی پر رحم آجائے تو ہمیں نجات دے۔ یہ دعا دل سے نکلی تھی۔ مجھے قرآن کی دو آیتیں یاد

تھیں، ان کا وِرد کیا اور کمرے میں سرسراہٹ سی سُنائی دی۔ مَیں نے سر گھمایا تو ایک عورت دبے پاؤں چارپائی کے قریب آتی نظر آئی۔ مَیں اس خیال سے ڈر گیا کہ اس عورت کے ہاتھ میں چاقو یا چھُرا ہوگا۔ ہم بندھے ہوتے ہیں اور یہ عورت ہماری گردنیں کاٹ دے گی یا ہمارے پیٹ چاک کر دے گی۔ ہمارے علاقے میں ایسے اکثر ہوتا ہے کہ ہماری طرح کے کسی چور یا ڈاکو کو پکڑ لیں تو اسے قتل کر کے اس کی لاش کہیں دبا دی جاتی ہے۔ ہم دونوں کا انجام بھی یہی تھا۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ شاید فاطمہ ہے جو ہمیں آزاد کرانے چوری چھپے آئی ہے لیکن یہ تو دل کو جھوٹی تسلی دینے والا دھوکہ تھا۔ وہ میری چارپائی کے قریب آئی تو وہ کوئی اور تھی۔ دیئے کی زرد روشنی میں مجھے اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک چاقو نظر آیا۔ اس عورت سے یہ التجا کرنا کہ وہ ہمیں جان سے نہ مارے بیکار تھا۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں اور مرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھنے لگا۔ لیکن میری گردن پر چاقو نہ آیا۔ مَیں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ عورت چاقو سے رسیاں کاٹ رہی تھی۔ مَیں بدستور ڈرتا رہا۔ یہ عورت ہمیں اپنے ساتھ لے جانے آئی تھی۔ ہمیں مردوں نے کہیں دُور لے جا کر قتل کرنا تھا۔

اس نے رسیوں کا سارا جال کھول دیا اور سرگوشی میں بولی "سب سوئے ہوئے ہیں۔ رات کا پچھلا پہر ہے۔ پَو پھٹنے سے پہلے نکل جاؤ" — شہباز نے پوچھا "فاطمہ کہاں ہے"؟ عورت نے دُکھی ہوئی سرگوشی کی "وہ اب اللہ کے حوالے..... مگر مت نکلو" — اور ہم عورت کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلے اور پھر گاؤں کی دیواروں کی اوٹ میں گاؤں سے نکل آئے۔

اس قدر سکوت اور ایسی خاموشی جیسے یہ گاؤں نہیں قبرستان ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے اس گاؤں میں قیامت خیز معرکہ لڑا گیا ہے۔ رکھوالی والے کُتے رات کو ہمارے

ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کوئی خطرہ موجود نہ تھا۔ وہ عورت گلیوں میں غائب ہوگئی۔ وہ عورت کون تھی؟ ہمیں کچھ علم نہیں۔ وہ فاطمہ کی ماں نہیں تھی۔ فاطمہ کی کوئی بہن نہیں تھی۔ شاید اس کی کوئی غم خوار اور ہمراز سہیلی تھی۔ ہم اسے پہچان نہ سکے ـــــ پو پھٹنے تک ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے، قدم گھسیٹتے، ہارے ہوئے سپاہیوں کی طرح اپنے گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔

گھر اور گاؤں والوں نے ہماری حالت دیکھی تو ہمارے گرد جمع ہوگئے۔ ہم نے وہی جھوٹ بولا جیسے دیہات میں بلا چون و چرا سچ مان لیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم ذرا فلاں گاؤں تک چلے گئے تھے۔ راستے میں چار آدمیوں نے روک کر کہا کہ جو کچھ پاس پلے ہے نکال کر رکھ دو۔ ہم مقابلے میں جم گئے۔ وہ چار تھے ہم دو۔ خوب مقابلہ کیا۔ ان کے دو آدمی گرے جنہیں وہ اٹھا کر بھاگ گئے اور ہم چوٹوں اور زخموں سے چور ایک درخت تلے لیٹ گئے ـــــ اور ہمارے گاؤں والے مان گئے۔

شاہ جی شہباز کی فاطمہ کے ساتھ شادی نہ کر سکے اور ان کی پہلی بیوی طلاق سے بچ گئی۔ مگر فاطمہ کہاں غائب ہوگئی؟ ـــ کسی کو علم نہیں۔ اسے قتل نہیں کیا گیا تھا نہ اس کی قبر تھی نہ اس کا سراغ ملا۔ اسے کہاں غائب کر دیا گیا تھا ہے ـــ آج تک پتہ نہیں چلا۔

تیسرے ہی دن راز فاش ہوگیا۔ فاطمہ کے گاؤں والوں نے ہمیں بے ہوش کر کے پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں وہاں پندرہ دن رہ چکے تھے۔ اس گاؤں کے چار آدمی ہمارے گاؤں میں آئے اور بھرے گاؤں میں سب کو بتایا کہ ہم دونوں نے کیا کیا ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ بزرگوں نے ہمارا کیا حشر کیا ہوگا۔ وہ چار آدمی انتقام کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ آخر ہمارے بزرگوں نے ان سے معافی مانگی اور بات تھانے یا انتقامی قتل تک نہ

پہنچ سکی۔ معلوم ہوا کہ ان کا کوئی آدمی ہمارے ہاتھوں مرا نہیں تھا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ صبح سے پہلے پہلے وہ ہمیں قتل کر کے لاشیں کہیں دبا دیتے۔ وہ حیران تھے کہ ہم وہاں سے بھاگ کر کس طرح آ گئے۔ اور میں آج تک حیران ہوں کہ ہمیں رہائی دلانے والی کون تھی۔

شہباز الیاس دل برداشتہ ہوا کہ ایک سال بعد فوج میں بھرتی ہوگیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اُن دنوں شمال مغربی سرحدی صوبے کا لام بہت مشہور تھا۔ قبائلی پٹھان انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے اور ہمارے جوان مر رہے تھے۔ شہباز بھرتی ہو کر گیا تو ڈیڑھ سال بعد اس کے گھر والوں کو تار ملا کہ شہباز بنوں سے آگے لڑائی میں مارا گیا ہے۔ اس کی لاش گاؤں میں نہیں آئی تھی۔ معلوم ہوا کہ اسے بنوں کے فوجی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ شہباز اور فاطمہ کی یادگار میرے کندھوں اور پیٹھ پر کلہاڑیوں کے زخموں کے نشان ہیں جن پر آج بھی ہاتھ پھیرتا ہوں تو دونوں کو اپنے سامنے ہنستا کھیلتا دیکھتا ہوں۔

اب ان شاہ جی کا بیٹا گدی نشین ہے جس کی چار بیویاں ہیں اور اکثر سننے میں آتا ہے کہ شاہ جی ایک اور شادی کر رہے ہیں۔ زمانہ کتنی ترقی کر گیا ہے مگر شاہ جی کی حکمرانی بدستور قائم ہے۔ کیا کوئی ترقیاتی منصوبہ اس حکمرانی کو ختم کر سکتا ہے؟

جیکی بیچاری کا کیا قصور؟

ایک کُتیا کئی کُتے۔ کُتوں کی دوستی دشمنی میں بدل گئی اور کہانی ایسے اندھیرے غار میں چلی گئی جہاں بھیڑیوں کا ایک جوڑا تھا۔ ایک انسان، ایک کُتے اور دو بھیڑیوں کا ہولناک معرکہ۔

اس کہانی میں بھی آپ کو کوئی آدم خور نہیں ملے گا۔ ہانکا نہیں ہوگا۔ میچان نہیں بنے گی اور ایک بھی گولی نہیں چلے گی۔

میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اُس وقت ہمارے پاس پندرہ کُتے تھے اور شکاریوں کی تعداد بارہ تھی۔ کُتوں کی ٹیم مکمل ہو گئی تھی۔ شکار کے لیے ایک دو بُو گیر کُتے ضروری ہوتے ہیں۔ ویسے تو ہر کُتا شکار کی بُو پا لیتا ہے لیکن ایک نسل ایسی ہوتی ہے جس کی سونگھنے کی حس حیران کُن حد تک تیز ہوتی ہے۔ یہ کُتا پوری ٹیم کی رہنمائی کرتا ہے۔ خرگوش اور گیدڑ بھی دشمن کی بُو پا لیتے ہیں اور دُور سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اتنی دُور سے کوئی کُتا اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس مقصد کے لیے ایک یا دو تازی

کُتے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ دُبلے پتلے ہڈیوں کے ڈھانچے سے ہوتے ہیں جنہیں ہمارے ہاں جہازی کُتے کہا جاتا ہے۔ ان کی رفتار حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اگر میں کہوں کہ تازی کُتے کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ سے زیادہ ہوتی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ کُتے شکار کو جا لیتے ہیں لیکن لڑتے یا کاٹتے نہیں کیونکہ ان کی فطرت میں درندگی نہیں ہوتی۔ وہ شکار کو روک کر الجھا لیتے ہیں۔ اتنی دیر میں دوسرے کُتے پہنچ جاتے ہیں اور شکار کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔

آپ مجھ سے ضرور پوچھیں گے کہ شکار کو تو کُتے چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے تو ہمیں کیا حاصل ہوتا تھا؟ — میرے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں کہ یہ لہو گرم رکھنے کا اِک بہانہ تھا۔

ہمارے کُتوں کی ٹیم صرف مکمل ہی نہیں تھی بلکہ اس میں خاص بات یہ تھی کہ ہمارے کُتے شکار پر آپس میں لڑتے نہیں تھے۔ ایک کُتے کے منہ میں خرگوش ہو تو دوسرے کُتے اس پر جھپٹنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ اس چھینا جھپٹی میں کُتوں کا خونریز معرکہ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے اپنے کُتوں کو ایسی ٹریننگ دے رکھی تھی کہ ایک کُتا دوسرے کُتے کے شکار پر صرف اُس وقت جھپٹتا تھا جب شکار اس کے منہ سے نکل بھاگے

ہم نے اپنے کُتوں میں یہ پیار چھ مہینے صرف کر کے بڑی محنت سے پیدا کیا تھا مگر ایک نوجوان کُتیا نے ٹیم میں شامل ہو کر کُتوں میں رقیبانہ دشمنی کی ایسی فضا پیدا کر دی کہ کُتا کُتے کا وَیری ہو گیا۔ اس کُتیا کا نام جَیکی تھا جس میں صرف یہی دو خوبیاں تھیں کہ وہ ہمارے ایک دوست کی کُتیا تھی اور وہ ایک خوبصورت کُتیا تھی مگر شکار کھیلنے کے قابل نہیں تھی۔ اگر اس قابل ہوتی بھی تو ہمارے لیے بیکار تھی کیونکہ کُتیا کو چند ایک

وجوہات کی بنا پر شکاری ٹیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔

جیکی کا مالک اچھو ہمارا دوست تھا۔ وہ ہمارے ساتھ شکار پر تو جایا کرتا تھا لیکن جیکی کو کبھی ساتھ نہیں لایا تھا۔ اسے بھی معلوم تھا کہ کتیا اس قسم کے شکار کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ مگر اچھو ایک اور وجہ سے بھی اپنی جیکی کو ساتھ نہیں لاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے اس کتیا سے بڑا ہی پیار تھا۔ بالکل ایسا پیار جیسا اکلوتے اور لاڈلے بیٹے سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی پیاری جیکی کو اتنا زیادہ دوڑانا نہیں چاہتا تھا۔ کسی محفل میں کتوں کی بات چل نکلتی تو وہ اپنی جیکی کی صفات مبالغے کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے جیکی کے چال چلن کے متعلق کہا تھا کہ ایسی اچھی نسل کی کتیا ہے کہ کسی ایسے ویسے کتے سے تو منہ نہیں لگائی۔

اچھو حساس طبع انسان تھا۔ اللہ اسے جنت نصیب کرے۔ آج یاد آتا ہے تو دل بوجھل ہو جاتا ہے۔ کیسے پیارے پیارے دوست تھے۔ ان میں اچھو فراز انا طبیعت کا تھا۔ اسے غصہ جلدی آجاتا تھا اور جیکی کے خلاف تو وہ ایک لفظ برداشت نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف ایک بار جیکی کو شکار پر لے گیا تھا مگر ایک جنگلی چوہے نے جیکی کو شرگ سے پکڑ کر بٹھا لیا تھا۔

ایک روز چھوٹے اچھو کو جانے کیا سوجھی کہ ہم شکار کو نکلے تو وہ اپنی جیکی کو بھی ساتھ لے آیا۔ یہ پہلی کتیا تھی جو ہمارے ساتھ شکار پر جا رہی تھی۔ ہمیں ان وجوہات کا تو علم تھا جن کی بنا پر کتیا کو شکار پر نہیں لے جایا جاتا۔ مگر ایک وجہ ایسی تھی جس کے متعلق ہم میں سے کسی نے بھی نہ سوچا۔ ہمیں اپنے کتوں کے ڈسپلن اور چال چلن پر بھروسہ تھا۔ بہرحال ہم نے ایک خطرناک پہلو کو نظر انداز کر دیا اور سمجھ ہی نہ سکے کہ جیکی

آگے چل کر کیا گل کھلائے گی۔

جیکی ہمارے ساتھ گئی تو اچھو نے اس کے پٹے سے زنجیر الگ کر دی۔ ہم بارہ چودہ نوجوان گپ شپ لگاتے چلے جا رہے تھے۔ کتے کھلے ہوتے تھے، وہ بھی ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ ہم بالکل بھول گئے تھے کہ کتے بھی جوان ہیں اور آج پہلی بار ان کے ساتھ ایک حسین و جمیل کتیا بھی آگئی ہے۔ میں نے کتوں کے رویے میں تبدیلی سی دیکھی۔ ہمارے دو بوگیر کتے کھلے علاقے میں جا کر ناک زمین سے لگاتے ادھر ادھر اور آگے ہی آگے تیزی سے چلا کرتے تھے۔ یہ ان کی ڈیوٹی تھی اور تازی کتے کان کھڑے کر کے، گردن تانے دور دیکھتے رہتے تھے تاکہ کسی جھاڑی یا کسی ٹیلے کی اوٹ سے شکار اٹھ بھاگے تو وہ اسے جالیں اور دوسرے کتے بے تابی سے تازی اور بوگیر کتوں کو دیکھتے رہتے تھے کیونکہ انہیں انہی کے اشارے پر شکار ملا کرتا تھا۔

اس روز بوگیر اور تازی کتے اپنی ڈیوٹی فراموش کیے بیٹھے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جیکی کو ساتھ نہیں لانا چاہیے تھا۔ میں نے دیکھا کہ جیکی آگے آگے اور تمام کتے جلوس کی صورت میں اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ بوگیر کتے شکار کی مشک سے بے نیاز عشق کی لگن سے سرشار ہو رہے تھے اور مجھے پہلی بار یہ محاورہ سمجھ میں آیا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں جا سکتے۔ جیکی شرمیلی کتیا تھی۔ اس نے شرم و حجاب سے دم ٹانگوں میں دے رکھی تھی اور سر جھکائے چلی جا رہی تھی۔ ہمارے ایک دوست افضل کا بوبلی کتا جو ٹیم میں سب سے زیادہ خوشخوار اور طاقتور تھا، جیکی کے منہ کے ساتھ منہ لگائے راز و نیاز میں محو چلا آ رہا تھا۔

ایک تازی کتے کی شامت جو آئی تو اس نے بھی چلتے چلتے جیکی کے دوسرے رخسار

کے ساتھ اپنا گال لگا دیا۔ بُوہلی نے دیکھا تو رُک گیا۔ جب جیکی اور تازی دو قدم آگے نکل گئے تو پیچھے سے بُوہلی نے تازی پر جست لگائی اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کی باریک سی گردن کو بے رحم جبڑوں میں لے لیا۔ تازی کی دہائی دہائی اور بُوہلی کی غراہٹ نے شکاریوں کو چونکا دیا۔ ہم تازی کو چھڑانے دوڑے۔ بُوہلی دُبلے پتلے تازی کو بُری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ دو لڑکوں نے بوہلی کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا، افضل نے ایک ڈنڈا بُوہلی کے منہ میں ڈال کر دبایا اور افضل کے چھوٹے بھائی ارشد نے بُوہلی کی ناک پر ہاتھ رکھ کر اس کی سانس روک لی جس سے بُوہلی کے دانتوں کا شکنجہ ڈھیلا ہوا ورنہ تازی کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

دوسرے کتے دُور کھڑے کبھی تازی کو، کبھی بُوہلی کو اور کبھی جیکی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تازی جو فطرتاً لڑائی جھگڑے کا قائل نہیں ہوتا، جان چھڑا کر ہمارے گرد گول دائرے میں سرپٹ بھاگنے لگا۔ اس کی آہ وزاری بڑی دردناک تھی۔ آخر وہ بُوہلی کی طرح کے ایک اور خونخوار کتے بُل ٹیریر کے پاس جا رُکا اور بُل ٹیریر اسے ایسی ہمدردی سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو ــــ "دل جلتا ہے تو جلنے دے۔ آنسو نہ بہا فریاد نہ کر۔"

کتے ایک اور کتے چودہ تھے۔ وہاں تو اس محاورے والا قصہ تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ طاقت اور خونخواری کے لحاظ سے بُوہلی سب کا سردار تھا۔ بھیڑیے سے بھی لڑ لیتا تھا۔ ایک بار اس نے منہ زور بھاگتے گھوڑے کو گردن کے نیچے سے پکڑ کر اسے گھٹنوں بٹھا دیا تھا۔ وہ جتنا غصیلا اور خونخوار تھا اتنا ہی وفادار بھی تھا۔ اس نے ٹیم کے کسی کتے پر کبھی حملہ نہیں کیا تھا۔ البتہ ٹیم کے دو کتے آپس میں لڑ پڑیں تو غصے میں آ کر دونوں کا باری باری بُرا حال کر دیتا تھا۔ مگر ایک خوبصورت کتیا کو ٹیم کے ساتھ دیکھ کر اس نے سب کو احساس دلایا کہ اس پر صرف اس کا حق ہے۔

بُوہلی کو قابو میں رکھنا محال ہو رہا تھا۔ دوسرے کتے اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہم کتوں کے باہمی پیار اور ٹیم سپرٹ پر ناز کیا کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کتا وفادار جانور ہوتا ہے لیکن یہ بھول گئے تھے کہ کتے کے چال چلن کی ضمانت کوئی نہیں دیا کرتا۔ ہم نے اچھو سے کہا کہ جیکی کو واپس لے جاؤ یا اسے زنجیر ڈال کے رکھو۔ اچھو آدمی تو اچھا تھا لیکن اسے غصہ جلدی آیا کرتا تھا۔ جیکی کی عزت کو اپنی آبرو سمجھتے ہوئے وہ ہم پر برس پڑا۔ کہنے لگا ــــ "اس میں جیکی بے چاری کا کیا قصور ہے؟ تم اپنے کتوں کو زنجیریں کیوں نہیں ڈالتے؟ سالے اجرام نسل کے کتے لیے پھرتے ہیں" ــــ اُس نے جیکی کو زنجیر تو ڈال دی لیکن ہمارے کتوں کو وہ ویسی نفرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا جن سے کتے بُوہلی کو دیکھ رہے تھے۔

ہم نے کتوں کو زنجیریں نہ ڈالیں۔ دوسرے کتے تو دُور دُور رہے، بُوہلی جیکی سے دُور نہیں ہٹتا تھا۔ وہ بار بار جیکی کے منہ سے منہ لگاتا تھا اور اچھو اسے ہر بار دھتکار دیتا تھا۔ آخر اس نے مٹی کا ڈھیلا اُٹھایا اور بُوہلی کے سر پر مارا۔ بُوہلی کا سر افضل زندہ دل انسان تھا۔ اس نے پرواہ نہ کی اور ہم سب ہنسنے لگے مگر بُوہلی کا غصہ بڑھ گیا تھا۔

ہم سب کھل کر ہنسے جس سے اچھو اور زیادہ بھڑک اُٹھا۔ ہم نے اسے ہنسی ہی میں ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن ہمیں نے دیکھا کہ کتوں کا غم و غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں الگ الگ یوں چلے جا رہے تھے، جیسے بُوہلی اور

تازی کی لڑائی کے متعلق کھسر پھسر کر رہے ہوں۔ میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنس رہا تھا لیکن دل پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہو۔ شکار پر نکلتے ہی کتوں نے جو مظاہرہ کیا تھا اسے میں برا شگون سمجھنے لگا۔ کتوں پر تو اس شگون کا اثر صاف نظر آ رہا تھا۔ بوگیر کتے اپنے کام میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ وہ لاتعلق سے ہو کر پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ جس تازی کتے پر بوہلی نے حملہ کیا تھا وہ ابھی تک بدک بدک کر ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ دوسرے کتوں کا بھی موڈ بگڑا بگڑا لگتا تھا۔

ہم چلتے چلے گئے۔ کسی نے چلا کر کہا۔ "خرگوش" — میں نے دیکھا۔ کوئی چار پانچ سو گز دور دو خرگوش پوری رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔ ہم نے کتوں کی توجہ ادھر کی تو انہوں نے روزمرہ والی سرگرمی نہ دکھائی۔ ہم نے تازی کتوں کو پٹوں سے پکڑ کر بھگایا۔ جس تازی کتے نے بوہلی سے مار کھائی تھی، اس نے تو بھاگنے سے انکار کر دیا لیکن دوسرے تازی نے خرگوش کو دیکھ لیا اور وہ ہوا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مار کھانے والا تازی بھی عادت کے مطابق دوڑ پڑا۔

دونوں تازیوں کے دوڑنے کی دیر تھی کہ تمام کتے ساری بے مزگی کو اور جھگڑے کو بھی بھول کر تازی کتوں کے پیچھے اڑنے کی رفتار سے دوڑ پڑے اور ان کے پیچھے پیچھے ہم بھی شلواریں گھٹنوں سے اوپر چڑھا کر دوڑنے لگے۔ شکار کی فضا عود کر آئی۔ کتے ایک بار پھر ٹیم کی صورت منظم ہو گئے تھے۔

راستے میں تھوڑی سی زمین ایسی آ گئی جو سیم کی وجہ سے بہت نرم مگر دلدلی تھی۔ اس کے آگے نشیب اور آگے چڑھائی تھی۔ کتے تو یہ رکاوٹیں عبور کر گئے۔ لیکن سیم زدہ

زمین نے ہماری رفتار سست کر دی۔ آگے نشیب سے نکل کر چڑھائی چڑھنے لگے تو یہ ٹوکدار کنکریوں سے اٹی پڑی تھی۔ ہمارے ہاں بعض علاقے ایسی کنکریوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان پر چلا تو جا سکتا ہے لیکن دوڑ و تو پاؤں ایسا پھسلتا ہے کہ انسان گر پڑتا ہے۔ نوکیلی کنکریاں ہاتھوں اور گھٹنوں کو شدید زخمی کر دیتی ہیں۔

ایک چڑھائی دوسرے کنکریاں، ہمارے دو ساتھی پھسل کر گرے۔ رکنے کا وقت نہ تھا۔ ہم نے انہیں گرتے دیکھا لیکن اس خیال سے کوئی بھی نہ رکا کہ وہ اٹھ کر پیچھے پیچھے آ جائیں گے۔ چڑھائی چڑھ کر آگے نکلے تو اترائی آ گئی۔ آگے کھیت تھے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم جب نشیب میں تھے شاید اس وقت کتے کسی اور سمت چلے گئے تھے۔ ہم دوڑتے گئے۔ اس علاقے میں ہم پہلی بار گئے تھے اس لیے دشواریوں اور اونچ نیچ سے واقفیت نہیں تھی۔

تین چار کھیتوں سے ہم آگے گئے تو ہمیں کتوں کا ایسا شور و غل سنائی دیا جیسے انہوں نے شکار پکڑ لیا ہو۔ آوازیں قریب سے آ رہی تھیں لیکن کوئی کتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم آواز کی طرف بھاگے تو آگے چوڑا سا کھڈ آ گیا جو چار پانچ گز گہرا تھا۔ تمام کتے کھڈ میں تھے لیکن وہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ بوہلی کتے نے اسی تازی کتے کی گردن کو منہ میں لے رکھا تھا اور اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ ایک بل ٹیریئر نے بوہلی پر حملہ کر دیا اور اس کی کمر پر دانت گاڑ دیے۔ بوہلی نے تازی کو چھوڑ دیا اور بل ٹیریئر پر ٹوٹ پڑا۔ دوسرے کتے شاید دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ وہ بھی آپس میں لڑ رہے تھے لیکن ان کی اکثریت بوہلی کے خلاف معلوم ہوتی تھی کیونکہ زیادہ تر کتے اسی پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے۔

ایک خرگوش کے بال اور سر الگ پڑا تھا۔ دوسرا خرگوش شاید مکل بھاگا تھا۔ معرکے کی وجہ خرگوش نہیں تھا۔ شکار پر کتے کبھی یوں نہیں لڑے تھے۔ اس فساد کی اصل وجہ جیکی تھی۔ بوہلی نے اس تازی کو بخشا نہیں تھا جس نے اس کی موجودگی میں جیکی کے منہ کے ساتھ منہ لگایا تھا۔ اب خرگوش کو بہانہ بنا کر وہ تازی پر ٹوٹ پڑا تھا اور دوسرے کتے بوہلی کی اس اجارہ دارانہ دھاندلی پر اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ بوہلی کی حمایت میں لڑنے والے کتے ذرا کمزور ہونے کی وجہ سے بوہلی کے حامی بن گئے تھے۔ ہم کتوں کی نفسیات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انسانوں کی طرح کتوں میں بھی ایک نسل خوشامدیوں کی ہوتی ہے۔

منظر بہت دلچسپ تھا۔ بوہلی ایک کتے کے ساتھ الجھتا تھا تو کوئی دوسرا کتا اس کی دم کو دانتوں سے کاٹ کر بھاگ جاتا تھا۔ بوہلی پیچھے کو مڑتا تھا تو کوئی اور کتا اس کی پچھلی ٹانگ پر دانت مار جاتا تھا۔ کتوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور اس کے خوشامدی کتے جو اقلیت میں تھے اس کی حمایت میں مار کھا رہے تھے۔ اگر کوئی ایک کتا بوہلی کی لپیٹ میں آ جاتا تو اسے وہ چیر پھاڑ دیتا۔

ہم زنجیریں لیے کتوں پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی مشکل سے ان کے پٹوں میں زنجیریں ڈالیں۔ افضل جب اپنے بوہلی کے پٹے میں زنجیر ڈالنے لگا تو اس وقت بوہلی نے بل ٹیریر کی پچھلی ٹانگ کو دانتوں میں جکڑ رکھا تھا اور بل ٹیریر بری طرح چیخ رہا تھا۔ افضل نے بوہلی کی گردن پر بڑے زور سے گھونسہ مارا تو بوہلی جس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، بل ٹیریر کی ٹانگ کو چھوڑ کر تیزی سے گھوما اور افضل کی پنڈلی میں دانت گاڑ کر اتنی تیزی سے جھٹکا چھوڑا کہ افضل کی چیخیں نکل گئیں۔

ہمارے کسی کتے نے کبھی یوں نہیں کیا تھا لیکن بوہلی خونخوار نسل کا کتا تھا جو معرکے میں اپنے مالک کی ٹانگ کو کسی کتے کی ٹانگ سمجھ بیٹھا۔ وہ غصے سے باؤلا ہو گیا تھا۔ افضل کے چھوٹے بھائی ارشد کے ہاتھ میں مضبوط ڈنڈا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے بوہلی کی کمر پر ڈنڈا مارا۔ کتے نے افضل کی ٹانگ چھوڑ دی۔ افضل نے اسے زنجیر سے پیٹنا شروع کر دیا۔ افضل کی پنڈلی سے خون چشمے کی طرح ابل رہا تھا درد کی شدت کو وہ اپنے اتنے اچھے کتے کو بے رحمی سے مار مار کر ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بوہلی درد سے بلبلا رہا تھا۔

ہم باقی کتوں کو قابو میں لا چکے تھے اور افضل کو منع کر رہے تھے کہ کتے کو نہ مارے لیکن افضل غصے سے پاگل ہو گیا تھا اور بوہلی کو پیٹے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اور ارشد نے اسے پکڑ لیا اور پیچھے کو گھسیٹا۔ بوہلی بھاگا اور کھڈ کے اندر ہی غائب ہو گیا۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ کھڈ کی ایک دیوار کے ساتھ پانی مار کی غار کا منہ تھا۔ بوہلی نے اس غار میں جا پناہ لی تھی۔ ہم نے سوچا کہ نکل آئے گا اور ہم افضل کے زخم کو دیکھنے لگے۔ کتے نے اس کی پنڈلی چبا ڈالی تھی۔ ہم ان شکاریوں میں سے نہیں تھے جو فسٹ ایڈ کا سامان بھی ساتھ لے جایا کرتے ہیں۔ ہر شکار پر ایک دو لڑکے یا کتے ضرور زخمی ہوتے تھے۔ ہماری فسٹ ایڈ یہ ہوتی تھی کہ زخم پر پیشاب کر کے اوپر مٹی کی تہہ جما دیا کرتے تھے اور کسی کی پگڑی پھاڑ کر زخم پر باندھ دیتے تھے۔ اس سے خون رک جاتا تھا۔ ہم نے افضل کے زخم کا بھی یہی علاج کیا۔

مرہم پٹی سے فارغ ہوتے تو بوہلی کو بدستور غائب پایا۔ وہ ابھی غار کے اندر ہی تھا۔ افضل نے اسے بہت ہی پیٹا تھا۔ ارشد نے غار کے اندر جا کر اسے پکارا لیکن

وہ باہر نہ نکلا۔ ارشد باہر آگیا اور ہم سب بُوہلی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہم میں سے کوئی نہ کوئی غار کے اندر جا کر اُسے پکار کر واپس آجاتا۔ جب بہت دیر گزر گئی تو مَیں اس ارادے سے غار میں چلا گیا کہ بُوہلی کو ساتھ لے کے ہی آؤں گا۔ مَیں نے ٹارچ اور ڈنڈا ساتھ لے لیا۔ ٹارچ ہم اکثر ساتھ رکھا کرتے تھے کیونکہ "پانی مار" کی غاروں میں بھی جانا پڑتا تھا۔

غار کا دہانہ تنگ تھا جس میں سے مجھے جھک کر اندر جانا پڑا۔ آگے غار فراخ تھا اور چھت اونچی۔ چند قدموں بعد ایک ٹیلہ سا آگیا جس کی چوٹی اور چھت میں فُٹ ڈیڑھ فُٹ کا فاصلہ تھا۔ اس کے دونوں پہلوؤں سے راستے اندر کو جاتے تھے۔ مَیں دائیں طرف سے آگے گیا تو دیکھا کہ فرش نیچے کو ہو گیا تھا۔ یہ اُترائی تھی۔ مَیں اترتا چلا گیا اور گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ٹارچ جلائی تو مَیں خوف زدہ ہو گیا۔ پُرانے زمانے کی ٹارچ کی مدھم سی روشنی میں ایسے نظر آیا جیسے تین چار انسانوں کی ننگی لاشیں چھت سے اُلٹی لٹکی ہوئی ہوں۔ اگر مَیں "پانی مار" کی غاروں سے واقف نہ ہوتا تو وہیں سے بھاگ آتا۔ یہ زیرِ زمین سیلاب کا کرشمہ تھا۔ مٹی کے لمبے لمبے ڈھیلے چھت سے لٹک رہے تھے جن کی شکل و صورت اور سائز اُلٹے لٹکے ہوئے انسانوں سے ملتا جلتا تھا۔

دو چار قدم آگے دیوار تھی جیسے غار ختم ہو گیا ہو۔ مَیں نے منہ سے سیٹیاں بجائیں بُوہلی کو پکارا لیکن وہاں خاموشی تھی۔ ٹارچ سے اِدھر اُدھر دیکھا تو بائیں طرف دیوار میں اتنا بڑا شگاف نظر آیا جس میں سے انسان سُکڑ کر گزر سکتا تھا۔ روشنی شگاف میں پھینکی اور مَیں نے ایک کندھا شگاف میں ڈالا، پھر ایک ٹانگ اندر کی اور دوسری طرف چلا گیا۔ وہیں سے راستہ دائیں کو گھوم گیا اور آگے غار خاصا کشادہ ہو گیا۔ فرش، دیواروں اور چھتوں پر ایسے نشان تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے پانی کتنی زور سے گزرا ہو گا۔

غار کا یہ حصہ دس بارہ قدم لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا اور فرش اُن حصوں کی نسبت بہت نیچے تھا جن میں سے مَیں گزر آیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ مَیں زمین میں نیچے ہی نیچے اترتا چلا جا رہا ہوں۔ اس حصے میں مجھے مانوس بدبو محسوس ہونے لگی۔ یہ گیدڑوں اُود بلاؤں، سیہہ وغیرہ کا مسکن تھا۔ اس میں سانپ اور بچھو بھی ہو سکتے تھے۔ اس لیے ہم ایک ٹارچ ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ مَیں نے زمین پر ٹارچ سے دیکھنا شروع کیا تو مجھے سیہہ کے لمبے لمبے کانٹے بکھرے ہوئے نظر آئے۔ کتوں کے پنجوں سے ملتے جلتے کئی پگ دیکھے۔ مگر پہچان نہ جاتے تھے کہ گیدڑوں کے ہیں یا لومڑیوں کے۔ ان میں بُوہلی کے پگ بھی ہوں گے جنہیں مَیں پہچان نہ سکا۔

اتنی مدت گزر جانے کے بعد آج مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ مجھے "پانی مار" کی پُراسرار بھول بھلیاں کس کس سمت لے گئیں۔ بس یہ پختہ ارادہ یاد ہے کہ مجھے بُوہلی کو تلاش کر کے باہر لانا ہے۔ یہ ہماری ٹیم کا بہت ہی قیمتی اور کارآمد کتا تھا۔ غار میں داخل ہونے سے پہلے اس کے مالک افضل نے کہا تھا کہ گم ہو جائے تو مت ڈھونڈو، اندر ہی مر جانے دو۔ لیکن مَیں جانتا تھا کہ اس نے غصّے میں ایسا کہا تھا کیونکہ بُوہلی نے اس کی ٹانگ کاٹ کھائی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی بُوہلی کو ضائع کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

مَیں غار کے اندر سوچ رہا تھا کہ کیا بُوہلی زنجیروں کی پٹائی سے اس قدر خوفزدہ ہو گیا ہے کہ "پانی مار" کے اندر اتنی دُور جا چھپا ہے؟ مجھے شک ہونے لگا کہ اندر اسے کوئی

شکار مل گیا ہوگا جس کے تعاقب میں وہ اتنی دُور چلا گیا ہوگا۔ بدبُو سے میرا دماغ پھٹنے لگا تو میں نے پگڑی اُتار کر ناک اور منہ پر لپیٹ لی۔ یہ بدبو زمین دوز دنیا کے باشندوں کی غلاظت اور مرے ہوئے چوہوں وغیرہ کی تھی۔

پھر مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے بُوہلی کی غراہٹ سُنی اور جب وہ بھونکا تو یقین ہوگیا کہ تھوڑی دُور آگے بُوہلی اس تاریک دنیا میں موجود ہے۔ اس کی آواز کے فوراً بعد میں نے ایک اور غراہٹ سُنی تو میں ڈر گیا۔ اس آواز کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ایک بھیڑیا پورے قہر سے غرّا رہا تھا۔ میں فیصلہ نہ کرسکا کہ مجھے آگے جانا چاہیئے یا نہیں۔ بھیڑیئے دو اور دو سے زیادہ بھی ہوسکتے تھے۔ سانپوں کا خطرہ الگ تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس موسم میں سانپ زمین کے نیچے چلے جایا کرتے ہیں۔ آپ شاید تصور نہ کرسکیں کہ اپنے کُتوں کے ساتھ ہمیں کتنا پیار تھا۔ ڈر اور خطروں کے باوجود میں نے فیصلہ کرلیا کہ بُوہلی کی مدد کو پہنچوں گا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آگے تین راستے تھے بلکہ تین دہانے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ ٹارچ کو بہت دیر سے جلائے رکھنے کی وجہ سے اس کی روشنی زرد پڑ گئی تھی۔ میں نے ٹارچ بجھا دی اور تینوں دہانوں کے ساتھ کان لگا کر سُنا کہ بُوہلی کہاں ہے۔

میں ایک دہانے میں کھڑا تھا کہ اندھیرے میں مجھے قریب ہی بھیڑیئے کی غضب ناک غراہٹ سنائی دی اور بھیڑیا یا بُوہلی میری ٹانگوں سے ٹکرایا۔ میں نے ٹارچ جلا دی اور دہانے کے اندر چلا گیا۔ میں ایک وسیع غار میں کھڑا تھا۔ چھت سے مٹی کی "انسانی لاشیں" لٹک رہی تھیں۔ غار بے قاعدہ سے گول دائرے کی شکل کا تھا۔ خوش قسمتی سے چھت اتنی اونچی تھی کہ سیدھا کھڑا ہُوا جاسکتا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ میرے سامنے والی دیوار کے ساتھ دو بھیڑیئے (ایک نر اور ایک مادہ) دانت نکالے ہوئے غرا رہے

تھے۔ ان کے قریب گھاس پھونس پڑی تھی جس پر ان کے دو بچے کلبلا رہے تھے۔ نر بھیڑیا بُوہلی پر حملہ کرنے کے لیے پینترا بدل رہا تھا اور بُوہلی ان سے ذرا فاصلہ پر کھڑا خوفناک طریقے سے غرّا رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ بھیڑیا کدھر سے حملہ کرتا ہے۔ بچّوں کی حفاظت کے لیے لڑتا ہُوا بھیڑیا چیتے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وہاں سے بھاگنا بھی آسان نہ تھا اور بُوہلی بھاگنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے ٹارچ کی روشنی میں یہ منظر دیکھا اور فوراً بُوہلی کو للکارا — "ہلا بُوہلی" — میری آواز پہچان کر بُوہلی گولی کی تیزی سے بھیڑیئے کی طرف لپکا۔ اُدھر سے بھیڑیئے نے جست لگائی۔ دونوں نے اگلی ٹانگیں اٹھائیں اور گتھم گتھا ہو گئے۔ بُوہلی کے لیے خطرہ یہ تھا کہ بھیڑیئے دو تھے اور دوسرا خطرہ یہ کہ بھیڑیئے کے پنجے چیرنے پھاڑنے کے لیے بہت تیز ہوتے ہیں اور کھال میں اُتر جاتے ہیں۔ بوہلی ایک داؤ کا ماہر تھا، وہ ہمیشہ گردن کو دبوچا کرتا تھا۔ اس نے بک جھپکتے بھیڑیئے کو پہلو کے بل گرا دیا اور جونہی بھیڑیا اُٹھا، بُوہلی نے اس کی گردن کو اوپر سے منہ میں لے کر جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

اگر بھیڑیا ایک ہی ہوتا تو بُوہلی جیت گیا تھا مگر مادہ نے جست لگائی اور بُوہلی کی پیٹھ پر پنجے گاڑ دیے اور اس کی گردن کو دانتوں میں دبا لیا۔ بُوہلی کا منہ کھل گیا اور بھیڑیئے کی گردن اس کے منہ سے نکل گئی۔ میرے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ میں نے مادہ کی کمر پر پوری طاقت سے ڈنڈا مارا اور وہ چیخ کر پرے جا پڑی۔ نر بھیڑیئے نے مجھے دیکھا تو میری طرف لپکا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا تو ٹھوکر سے گر پڑا۔ اور ٹارچ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ مجھ میں اور بھیڑیئے میں یا یوں کہیئے کہ میرے اور موت کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ لیکن بُوہلی نے پہلو سے بھیڑیئے پر جھپٹا مارا اور ایک بار پھر اس

کی گردن کو دانتوں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔

خوش قسمتی سے ٹارچ جل رہی تھی جس سے غار روشن تھا۔ میں اُٹھ رہا تھا کہ مجھے یاد آگیا کہ میری واسکٹ کی جیب میں چاقو ہے۔ یہ چھ انچ لمبے پھل والا چاقو تھا۔ میں نے فوراً چاقو نکال کر کھول لیا۔ زنبھریئے کو بُوہلی نے پکڑ رکھا تھا اور مادہ نے مجھ پر جست لگا کر حملہ کرنے کی بجائے منہ نیچے کر کے میری ٹانگوں پر حملہ کیا لیکن وہ تیزی سے نہ آئی بلکہ غراتی ہوئی آہستہ آہستہ آئی۔ اسے شاید معلوم تھا کہ یہ انسان ہے جس سے اسے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ میرے قریب آئی تو میں نے اوپر سے اس پر چاقو کا وار کیا لیکن اس چالاک درندے نے نہایت پھرتی سے ایک طرف ہو کر وار بچا لیا۔

غار کے اندر گھٹن بہت تھی۔ بدبو سے بچنے کے لیے میں نے ناک اور منہ پر پگڑی لپیٹ رکھی تھی جس سے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ میں ہانپ بھی رہا تھا۔ میں نے تنگ آکر پگڑی کھول دی۔ بدبو کا بھبھوکا ایک لخت نتھنوں میں داخل ہوا تو مجھے چکر آگیا۔ لیکن جان کے خطرے نے مجھے سنبھالے رکھا۔ مادہ نے پینترا بدلا تو وہ بُوہلی سے ٹکرا گئی۔ بُوہلی نے بھیڑیے کو گردن سے پکڑ کر بے بس کر رکھا تھا۔ مادہ نے مجھ سے توجہ ہٹا کر بُوہلی کی کمر میں دانت گاڑ دیئے۔ میں نے پوری طاقت سے چاقو کا وار کیا تو چاقو مادہ کی پیٹھ میں اُتر گیا۔ مادہ ایسی ہولناک چیخیں مار مار کر غار کے اندر بھاگنے لگی کہ مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میں اس کی پیٹھ سے چاقو نکال نہیں سکا تھا۔ وہ چاقو کا پورا پھل پیٹھ میں لیے غار میں بھاگ بھی رہی تھی اور لوٹ پوٹ بھی ہو رہی تھی جس سے چاقو زمین سے ٹکرا ٹکرا کر اسے اور زیادہ کاٹتا جا رہا تھا۔

میں بُوہلی کو دیکھ رہا تھا کہ میرا دایاں ٹخنہ تیز دھار دانتوں کے شکنجے میں

آگیا۔ میں نے دیکھا، مادہ نے پیچھے سے آکر میرے ٹخنے کو منہ میں لے لیا تھا۔ دانت کھال میں اُتر کر ہڈی کو کاٹ رہے تھے۔ میں نے نصف انچ موٹے تلے والی پشاوری چپل پہن رکھی تھی جس کے نیچے موٹے سُروں والے کیل لگے ہوئے تھے۔ شکار میں ایسے ہی چپل چل سکتے تھے۔ میں نے بایاں پاؤں اٹھا کر مادہ کے سر پر مارا۔ اس کے دانت تو اکھڑ گئے۔ لیکن وہ کھال ساتھ لے گئی۔ اس کی پیٹھ میں میرا چاقو تھا جو اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ مادہ پہلو کے بل گر کر اُٹھ رہی تھی کہ میں نے پوری طاقت سے اس کے سر پر ڈنڈا مارا۔ یہ شاہ بلوط کی لکڑی کا خاصا موٹا ڈنڈا تھا جس نے اسے بے حال کر دیا۔ اوپر سے ایک اور ڈنڈا مارا تو اس کی کھوپڑی ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس کا سر زمین سے جا لگا اور وہ گر کر تڑپنے لگی۔ میں نے سر پر ہی ڈنڈے کا ایک اور وار کیا تو اس کی کھوپڑی پچک گئی۔ میں نے اس کی پیٹھ سے چاقو نکال لیا۔

بدبو، تھکن اور خوف سے میرا سر ڈوبنے لگا۔ ٹارچ کی روشنی اس قدر مدھم ہو گئی کہ بُوہلی اور بھیڑیا بڑے غور سے دیکھنے سے نظر آتے تھے۔ میں نے ٹارچ کو اُٹھا کر جھٹکے دیئے تو روشنی ذرا سی تیز ہوئی پھر مدھم ہونے لگی۔ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے خشک ٹہنی کو توڑا ہو۔ میں نے ٹارچ قریب کر کے دیکھا۔ بوہلی نے بھیڑیے کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔ بھیڑیا تڑپ تڑپ کر تڑپنے لگا۔ بُوہلی نے اس کے جسم پر اگلے پاؤں رکھ کر اس کی گردن کو ایسا بُری طرح پھاڑا کہ بھیڑیے کا سر الگ ہو گیا۔ بھیڑیا ذرا سا تڑپا اور مر گیا۔

میں نے بُوہلی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا پھر تھپکی دے کر اسے بھیڑیے سے الگ کیا۔ وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ وہ میرے پچکارنے پر میرے ساتھ ہو لیا۔ اچانک ٹارچ بالکل ہی بجھ گئی۔ میں نے کہا۔ "چلو بُوہلی" — اور میں ٹٹول ٹٹول کر غار کا دہانہ تلاش کرنے لگا۔ بُوہلی میرے

آگے آگے چلا تو مَیں اس کے قدموں کی آواز پر پیچھے پیچھے چل پڑا۔ گھُپ اندھیرا تھا۔ بُوہلی تیزی سے آگے کو چلا گیا اور مَیں اندھیرے میں جھٹک گیا۔ جدھر ہاتھ کرتا، ہاتھ دیوار کو لگتے۔ کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ مَیں بُوہلی کو پکارنے لگا۔ وہ بھونکتا ہُوا واپس آ گیا اور میری ٹانگوں کے درمیان آن کھڑا ہُوا۔ مَیں نے جُھک کر اُس کا پٹہ پکڑ لیا۔ اور وہ چل پڑا۔ اب مَیں کہیں بھی نہ ٹکرایا نہ بھٹکا مگر مدبُو سے غشی طاری ہونے لگی اور ٹخنے سے خون بہتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے بعد خواب کی طرح یاد ہے کہ میرے ہاتھ سے بُوہلی کا پٹہ چھوٹ گیا تھا اور مَیں تھوڑی دُور چل کر ایک دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ مَیں نے آخری بار بُوہلی کو بلایا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو مَیں آسمان کے نیچے دھوپ میں پیڑھے کے بل لیٹا ہُوا تھا اور میرے تمام دوست میرے اردگرد بیٹھے تھے۔ مَیں اُٹھ بیٹھا۔ ٹخنے میں زخم کا درد محسوس ہو رہا تھا۔ میرے ساتھیوں نے زخم پر کپڑا باندھ دیا تھا۔ انہوں نے مجھے سُنایا کہ جب مجھے اندر گئے بہت وقت گزر گیا تو دو تین لڑکے غار میں داخل ہوئے لیکن گھُپ اندھیرے کی وجہ سے راستے میں ہی رُک کر مجھے آوازیں دے دے کر واپس آ گئے۔ اندھیرے میں انہیں کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ ٹارچ میرے پاس تھی۔ اُن میں سے کسی کے پاس دیا سلائی بھی نہیں تھی کیونکہ کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ مَیں اتنی دُور چلا گیا تھا کہ اُن کی آوازیں مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ وہ بہت فکرمند ہوئے اور سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے۔

بہت دیر بعد بُوہلی باہر نکلا۔ وہ بے تابی سے افضل کے گرد گھُومنے لگا اور پھر غار کے اندر چلا گیا۔ افضل کُتے کا اشارہ سمجھ گیا اور کُتے کے پیچھے غار میں داخل ہو گیا۔ بُوہلی اندر جا کر پھر باہر آیا۔ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ بہت ہی بے چین تھا اور اس طرح بھونکتا تھا جیسے

کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ پھر غار میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو افضل کو خدا نے عقل دی۔ اُس نے بُوہلی کے پٹے میں زنجیر ڈال دی اور بُوہلی غار میں آگے آگے چل پڑا۔ افضل زنجیر پکڑے ہوئے اس کی رہنمائی میں چلتا چلا گیا۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے ارشد بھی اندر چلا گیا اور ارشد کے پیچھے ہمارا ایک اور ساتھی احمد بھی چلا گیا۔ بُوہلی وہاں پہنچ کر رُک گیا جہاں مَیں بے ہوش پڑا تھا۔ میرے تینوں ساتھیوں نے اندھیرے میں ٹٹول کر مجھے اُٹھا لیا اور بُوہلی کی رہنمائی میں باہر لے آئے۔ اللہ نے یہ کرم کیا کہ اندر کوئی سانپ نہیں تھا۔

افضل کی ٹانگ بھی بُری طرح کٹی ہوئی تھی۔ میرا ٹخنہ مجھے چلنے نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے دوستوں نے ہمیں کندھوں پر اُٹھا لیا اور ہم اچھو کی بھیکی کو کوستے ہوئے گھر چل دیئے۔ یہ رقیبانہ فساد بھیکی نے ہی برپا کیا تھا۔

پوٹھوہار میں ریچھ کہاں ؟

پوٹھوہار میں ریچھ نہیں ہوتے، پھر یہ ریچھ کہاں سے
آگیا جس نے ہمارے ایک دوست اور ایک کتے کو
چیر پھاڑ دیا؟ ایک معمّا ایک معرکہ!

اگر میں کہوں کہ ہم نے پوٹھوہار کے علاقے میں ایک ریچھ شکار کیا تھا تو آپ فوراً کہیں گے ــــ "جھوٹ" اس علاقے میں نہ کبھی جنگلی ریچھ دیکھا گیا ہے نہ کبھی دیکھا جائے گا" ــــ آپ ٹھیک ہی کہیں گے لیکن ہم نے کتوں سے ایک ریچھ مار امر ور تھا اور یہ میری زندگی کا ایک اور یادگار واقعہ ہے۔

ہم نے شکاری بندوق دیکھی ضرور تھی، چلائی کبھی نہیں تھی۔ ہماری برادری کے ایک بزرگ صوبیداری پنشن آئے تھے تو دونالی بندوق اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کے پاس چوبیس کارتوس تھے۔ وہ جب فوت ہوئے تو ان کے گھر میں چوبیس کارتوسوں کے توں پڑے تھے۔ جب تک زندہ رہے بندوق اٹھاتے پھرتے رہے۔ انہوں نے صرف ایک بار بندوق چلائی تھی مگر کارتوس بھر کر نہیں، لاٹھی کی طرح اور وہ بھی ایک بھینس پر جو اُن کی فصل کھا رہی تھی۔

بندوق کا کام ہم غلیل سے لیا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں ہرن، چیتل اور بارہ سنگھے تو تھے نہیں۔ فاختہ اور جنگلی کبوتر ہوتے تھے جو ہم غلیل سے مار لیا کرتے تھے۔ باقی شکار ہم کتوں سے کھیلا کرتے تھے۔

ایک روز ہم شکار کے لیے نکلے۔ ساون کے دن تھے۔ پوٹھوہار کا ساون بڑا اچھا ہوتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر گھٹائیں گر جتی آتی ہیں اور دوسرے دن کے پہلے پہر تک برستی رہتی ہیں۔ علاقہ پہاڑی ہے۔ کچھ پہاڑیاں پتھروں کی ہیں اور زیادہ تر مٹی کے ٹیلے ہیں۔ ان میں برساتی ندی نالے زیادہ ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو ہر ندی نالہ سیلابی دریا بن جاتا ہے اور شام تک سیلاب بہہ جاتا ہے۔ اب وہ بات نہیں رہی کیونکہ جگہ جگہ چھوٹے ڈیم بنا دیے گئے ہیں جہاں پانی رُک جاتا ہے اور ندیوں میں (جنہیں پوٹھوہاری زبان میں کس کہتے ہیں) سیلاب نہیں آتا۔

ہم مئی، جون اور جولائی کے مہینے میں شکار کے لیے نہیں نکل سکتے تھے کیونکہ گرمی بہت زیادہ تھی اور لُو چلتی تھی۔ جولائی کے آخر میں جب ساون کی گھٹاؤں نے گرمی کی شدت کم کر دی تو ہم نے ایک روز کتے کھولے اور چل پڑے۔ گیارہ کتے تھے اور بارہ لڑکے۔ ہر ایک لڑکا روٹی ساتھ لے آیا تھا۔ یہ ہماری شکاری ٹیم تھی۔ جب ہم گاؤں سے نکلے تو گاؤں کی فضا گالیوں سے گونج رہی تھی۔ یہ گالیاں ہمیں ہماری مائیں دے رہی تھیں۔ کوئی منڈیر پہ کھڑی تھی کوئی دروازے میں۔ اور دو گاؤں سے باہر آگئی تھیں۔ یہ تمام مائیں بازو ہوا میں لہرا لہرا کر ہمیں کوس رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ ہمارے والد صاحبان کو بھی کوسنے مل رہے تھے۔ والد تو سب کے موجود تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ہنس رہے تھے۔

اللہ بخشے ان تمام والدوں کو جو ہمیں شکار سے روکنے کی بجائے ہماری حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ وہ دور کچھ اور تھا۔ ہر باپ کی یہی ایک خواہش ہوتی تھی کہ اس کے بیٹے کو گاؤں والے مرد کا بچہ کہیں اور اس کا جسم گٹھا ہوا ہو۔ اُس زمانے میں شکل و صورت اور لباس کوئی نہیں دیکھا کرتا تھا۔ جسم کی مضبوطی، دلیری اور شرافت کو لوگ پسند کرتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابھی فلمیں عام نہیں ہوئی تھیں اور دیہات میں فلمی گیت سُنانے کے لیے ٹرانسسٹر نہیں آئے تھے۔

ہمارے باپ ہمیں آرام سے بیٹھنے نہیں دیا کرتے تھے۔ مائیں گالیاں دینے میں حق بجانب تھیں۔ شکار میں کوئی نہ کوئی لڑکا زخمی ضرور ہوتا تھا۔ دو مر بھی گئے تھے تھوڑا ہی عرصہ پہلے میرے ٹخنے کو بھیڑیے نے کاٹ کھایا تھا اور افضل کی ٹانگ بُوہلی نے چبا ڈالی تھی۔ زخم ملتے دو مہینے گزر گئے تھے۔ جب تک ہم واپس نہیں آتے تھے ہماری مائیں بار بار چھتوں پر جا کر ہماری راہ دیکھتی تھیں اور جب ہم واپس آتے تھے تو مائیں ویسی ہی گالیوں اور کوسنوں سے ہمارا استقبال کرتی تھیں جیسی گالیوں سے رخصت کرتی تھیں۔ ان کے غصے سے پتہ چلتا تھا کہ ہمیں کچا کھا جائیں گی لیکن وہ مائیں تھیں۔ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ ہمیں خراش بھی آئے۔

میری ماں کا انداز یہ تھا کہ میں شام کو شکار سے آیا تو ماں نے دانت پیس کر کہا ــــ "تیرے کلیجے سے توپ کا گولا گزر جائے۔ آیا ہے تو پہلے نہا لے" ــــ اُس نے آگ بگولا غصے سے میری قمیص اتار دی اور اس قسم کے مکالمے جاری رکھے "ایسا بیٹا نہ جنتی تو کیا ہو جاتا۔ بیٹی ہو جاتی تو گھر بیٹھی چکی تو پیس لیتی ــــ جیسا باپ ویسا بیٹا۔ میری قسمت کھوٹی۔"

والد صاحب آہستہ سے بولے ــــ "روز تھوڑے ہی جاتا ہے۔ آج چلا گیا تو کیا قیامت آگئی۔"

"تو تُو بھی چلا جاتا ساتھ ہی" ماں نے دونوں ہاتھ والد صاحب کے منہ میں دے کر کہا ــــ "تو یہاں کھاٹ ڈھیلی کرنے کیوں پڑا رہ گیا تھا۔"

والد صاحب نے کروٹ بدل کر کہا "یہ تو کتوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ بالوں کو تھوڑے ہی لے جاتے ہیں۔"

ماں کا غصہ عروج پر پہنچا ہُوا تھا۔ اسی غصّے سے میری قمیص اتار کر وہ دیکھ رہی تھی کہ مجھے کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ جب میں نہا چکا تو ماں نے بدستور گالیاں دیتے ہوئے میرے آگے گھر کے گھی میں تلے ہوئے پراٹھے، ان پر مکھن اور ساتھ دودھ رکھ دیا۔ جانتی تھی کہ بیٹا دن بھر کا تھکا ہُوا ہے اور جب اگلی صبح والد صاحب نے مجھے جگایا تو ماں ان پر برس پڑی ــــ "مت جگا اسے ..... کل سارا دن کتوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ اس مردود کے تو جوڑ بھی دُکھ رہے ہوں گے۔ جاتو اکیا! ۔ اسے سونے دے" ــــ یہ تھا ماں کا پیار۔ آج مرحومہ کی ہڈیاں بھی خاک ہو گئی ہیں اور میں قبر کے کنارے بیٹھا ہوں۔ آدھی صدی گذر چلی ہے مگر وہ گالیاں یاد آتی ہیں تو ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔

ہمارے غم میں پریشان ہونے والیاں صرف مائیں نہیں تھیں، بہنیں بھی تھیں لیکن انہوں نے کبھی اتنا اودھم نہیں مچایا تھا۔ ان کے علاوہ چوری چھپے ہمارے غم میں پریشان ہونے والیاں بھی تھیں۔ یہ ہماری منگیتریں تھیں۔ آیئے آپ کو ریچھ کی کہانی سُنانے سے پہلے ایک منگیتر کا قصہ سُنا دوں۔

ہمارے ایک دوست ناصر کے پاس بُل ٹیریر نسل کا کُتا تھا۔ ناصر ہماری ٹیم کا سرگرم شکاری تھا۔ برادری کے ایک گھرانے سے اس کے خاندان کی دشمنی چل رہی تھی۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ منگیتر کا گھر اس کے گھر کے ساتھ تھا۔ شکار پر جب ہمارے ساتھ حادثے زیادہ ہونے لگے تو گاؤں کی عورتوں نے ہمارا شکار ختم کرنے کی مہم چلا دی لیکن مردوں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ ایک صبح ناصر نے دیکھا کہ اس کا بُل ٹیریر گھر میں مرا پڑا ہے۔ کُتے کی موت کو ہم کسی انسان کی موت کے برابر سمجھا کرتے تھے۔ آپ میری کہانیوں سے اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ کُتے کیسے کیسے مشکل وقت میں جہاں ان کی اپنی موت کا خطرہ ہوتا تھا ہمارا ساتھ دیا کرتے تھے۔

ناصر کا کُتا مرا تو صفِ ماتم بچھ گئی لیکن کُتا قدرتی موت نہیں مرا تھا۔ پہلے تو شک ہُوا کہ اسے سانپ ڈس گیا ہے۔ مگر دو بوڑھوں نے کُتے کی باہر نکلی ہوئی زبان اور جسم کو بڑی غور سے دیکھ کر کہا کہ اسے سانپ نہیں ڈسا۔ اسے کوئی انسان ڈنک مار گیا ہے۔ ہمارے علاقے میں اکثر ایسے واقعات ہُوا کرتے تھے کہ دشمنی کی بنا پر کسی کی دودھ والی بھینس یا بڑی اچھی نسل کے بیل کو چوری چھپے چارے میں زہر دے دیا جاتا تھا۔ ناصر کا کُتا مر گیا تو سب اس نتیجے پر پہنچے کہ کُتے کو ناصر کے دشمن گھرانے نے زہر دیا ہے۔

ناصر اور اس کے بھائیوں نے گاؤں کے وسط میں کھڑے ہو کر اپنے دشمنوں کو للکارا۔ دوسرا فریق بھی نکل آیا۔ بزرگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا مگر ناصر نے دھمکی دے دی کہ وہ اپنے کُتے کے بدلے ایک انسان کا خون کرے گا۔ ہم جانتے تھے کہ یہ خالی دھمکی نہیں ہے۔ اب کوئی آدمی ضرور قتل ہو گا۔ ناصر بالکل پاگلوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ ہم سب دوست

اسی کی طرح بھڑکے ہوئے تھے۔ ہم ناصر کے حامی تھے۔ اگر ہمیں پتہ چل جاتا کہ کُتے کو کس نے زہر دیا ہے تو بخدا ہم اسے کُتوں سے مروا تے۔

گاؤں کی فضا میں خاصا کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ مگر چار پانچ دنوں بعد ہم نے دیکھا کہ ناصر بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ ایک روز میں نے اس کے کُتے کا ذکر چھیڑ دیا تو اس نے بے پروا سے لہجے میں جواب دیا ــــ "دفع کرو یار۔ کُتا ہی تھا نا۔ مر گیا ہے تو کیا ہُوا" ــــ ہم حیران ہوئے۔ مگر ہم ناصر کو بزدل نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ تو بڑا ہی زہریلا لڑکا ہُوا کرتا تھا۔

پندرہ دنوں بعد ناصر کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی منگیتر کا ایک بھائی فرنٹیئر میں فوج میں حوالدار تھا۔ وہ شادی سے چار روز پہلے چھٹی لے کر آ گیا۔ وہ آیا تو اس کے ساتھ ایک بل ٹیریر کُتا تھا۔ ہم سمجھے کہ وہ شاید خود کُتوں کا شوقین ہے لیکن ناصر کی شادی ہوئی تو جہیز کے ساتھ یہ بُل ٹیریر کُتا بھی آیا۔ جہیز میں بھینس یا گائے تو ہمارے ہاں کبھی کبھی دی جاتی تھی، کُتا کبھی نہیں دیا گیا تھا۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ ناصر کے مرے ہوئے کُتے کی کمی پوری ہو گئی ہے لیکن یہ سوال ہم سب کے دلوں میں کھٹک رہا تھا کہ ناصر نے کُتے کی موت پر دشمنوں کو جو دھمکی دی تھی اس سے پھر کیوں گیا ہے۔

وہ ہمارا گہرا دوست تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے کبھی کوئی بات چھپائی نہیں تھی۔ شادی کے بعد ایک روز ہم نے اس سے پوچھا کہ اس کا غصہ ختم کیوں ہو گیا تھا۔ اس نے رازداری سے ہمیں بتایا کہ اس کے کُتے کو اس کی منگیتر نے زہر دیا تھا ــــ ہم اور زیادہ حیران ہوئے کہ منگیتر کو ایسی کیا ضرورت آ پڑی تھی کہ اپنے

ہونے والے خاوند کے کُتے کو زہر دے دے؟

ناصر نے عجیب سی بات سنائی جو مجھے آج اس بڑھاپے میں بھی لفظ بلفظ یاد ہے۔ اُس نے سنایا "ہمیں جب شک ہُوا کہ کُتے کو ہمارے دشمنوں نے زہر دیا ہے تو ہم کلہاڑیاں لے کر نکل آئے۔ اُدھر سے وہ بھی نکل آئے۔ اگر لوگ درمیان میں نہ آجاتے تو خون خرابہ ہو جاتا۔ اس کے بعد میں نے دشمنوں کو دھمکی دی کہ کُتے کے بدلے ایک آدمی کو قتل کروں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے کونسے آدمی کو قتل کروں گا۔ دوسرے دن مجھے ایک عورت کی زبانی اپنی منگیتر کا پیغام ملا کہ خدا کے لیے کسی کو جان سے نہ مارنا تمہارے کُتے کو میں نے زہر دیا تھا۔ شادی کی پہلی رات تمہیں ساری بات بتاؤں گی۔"

ناصر اپنی منگیتر کو دل و جان سے چاہتا تھا اور وہ بھی اسے بہت پسند کرتی تھی۔ نام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ شادی کی پہلی رات اس کی منگیتر نے جو اب اُس کی بیوی بن چکی تھی یہ کہانی سنائی کہ وہ ناصر کو شکار سے باز رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ماؤں کی طرح اسے گالیاں نہیں دے سکتی تھی۔ ناصر جب شکار پر نکل جاتا تھا تو وہ اس کی واپسی تک پریشان رہتی تھی اور کسی نہ کسی بہانے کوٹھے پر جا جا کر دیکھتی رہتی تھی کہ ناصر واپس آیا ہے یا نہیں۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ شکار پر ہمارے نوجوان مر بھی گئے تھے اور زخمی تو بہت سے ہو چکے تھے۔ ناصر کی منگیتر یہی دعائیں کرتی رہتی تھی کہ ناصر کو خدا سلامت رکھے۔ پھر ایک روز ایک اور دوست مارا گیا اور پھر ہمارے پیرچی کا بیٹا بھی مارا گیا تو سارے علاقے میں دہشت پھیل گئی۔ (یہ کہانی آپ اسی کتاب میں پڑھیں گے۔) ناصر کی منگیتر تو بہت ہی پریشان ہوئی۔ بہت عرصہ سوچ سوچ کر اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کہیں سے زہر حاصل کر لیا جسے کُچلا کہتے ہیں۔ یہ باقلے کُتوں کو مارنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ناصر کی منگیتر نے زہر گوشت کی کچی بوٹی میں بھرا اور رات کے وقت جب سب سوئے ہوئے تھے اور کُتا ناصر کے صحن میں بندھا ہُوا تھا، بوٹی اپنے گھر سے کُتے کے آگے پھینک دی۔ بوٹی کُتے کے قریب گری جو کُتے نے فوراً کھالی اور صبح جب سب جاگے تو کُتا مرا پڑا تھا۔

اس کے بعد جب اُس نے ناصر کا غصہ دیکھا اور اسے جب یہ بھی معلوم ہُوا کہ ناصر کُتے کے غم میں ستا بھی رہتا ہے تو اس سے یہ بھی برداشت نہ ہُوا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ناصر ایک کُتے کے غم میں اپنا یہ حال کر دے گا۔ اس نے اپنی ایک شادی شدہ بہن کو راز دار بنا کر اپنے فرنٹیئر والے بھائی کو خط لکھوایا کہ بُل ٹیریر نسل کا ایک کُتا ساتھ لیتا آئے۔ یہ نسل فرنٹیئر میں زیادہ ملتی تھی۔ دونوں بہنوں نے بھائی کو یہ بھی لکھا کہ ناصر کا کُتا مارا گیا ہے۔ اسے جہیز میں کُتا دینا ہے۔ ان کا کُتا بھائی لے آیا اور ناصر کا غم ہلکا ہو گیا اور گاؤں میں خون خرابہ بھی نہ ہُوا — یہ تھی محبت کی ایک کہانی۔

ہاں تو میں سُنا رہا تھا کہ ساون کا مہینہ تھا۔ ہم کُتے ساتھ لیے گاؤں سے نکلے تو ماؤں نے ہمیں حسبِ معمول "پُرجوش" طریقے سے رخصت کیا اور ہم کان لپیٹ کر گاؤں سے دُور نکل گئے۔ آگے نشیبی علاقہ آگیا جہاں ہم ماؤں کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اس سے آگے کھڈ نالوں کا علاقہ شروع ہو گیا۔ ہم باقاعدہ راستوں سے ہٹ کر کھڈ نالے عبور کرتے چلے گئے۔ کُتوں کی زنجیریں کھول دی تھیں۔ بُوگیر کُتے بڑی بے تابی سے ہم سے آگے نکل کر اس طرح آگے اور دائیں بائیں دوڑ رہے تھے کہ ان کے منہ زمین سے لگے ہوتے تھے۔ وہ شکار کی بُو پا کر سراغ رسانی کر رہے تھے۔ دو تازی کُتے جنہیں ہم جہازی کُتے کہا کرتے تھے، کان کھڑے کیے بُوگیر کُتوں کو دیکھ رہے تھے اور دوسرے کُتے اِدھر اُدھر ہمارے

ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔

ہم پانچ چھ میل تک چلے گئے۔ کوئی شکار نظر نہ آیا۔ آگے ایک کس آ گیا جس کے دونوں طرف دو دو سو فٹ اونچی پہاڑیاں دیواروں کی طرح سیدھی کھڑی تھیں۔ یہ مٹی کی پہاڑیاں تھیں جن پر چڑھنے کے لیے ڈھلانی راستے بنے ہوتے تھے۔ کس میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ ہم نیچے اُتر گئے۔ کتوں نے پانی پیا اور ہم نے بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ مغرب کی طرف گھٹا چھائی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ پوٹھوہار میں مغرب سے اُٹھی ہوئی گھٹا بے سے بغیر نہیں جاتی اور برستی بھی بڑی زور سے ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ گھٹا جو اُٹھ رہی ہے ہمارا کیا حشر کرے گی۔ ہم جانتے تھے کہ ندی نالے اور کس چڑھ جائیں گے اور ہم رات تک ان میں سے گزر نہیں سکیں گے لیکن شکار کی لذت تو ایسی ہی دشواریوں میں ملتی تھی۔

ہم اُٹھے اور کس کے دوسرے دو سو فٹ بلند کنارے پر چڑھ گئے۔ آگے کا علاقہ ویران تھا اور اس سے دو تین میل آگے وہ پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جو جہلم تک پھیلی ہوئی ہیں یہ پہاڑی سلسلہ سرگودھا کی طرف سکیسر تک جاتا ہے۔ اچانک بوگیر کتے اپنے مخصوص انداز سے بھونکے اور آگے کو دوڑے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک گیدڑ سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ دونوں تازی کتے ہوا ہو گئے۔ تازی کتے کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتا ہے اور اس کی دوڑنے کی رفتار حیران کن۔ یہی اس کا قدرتی وصف ہوتا ہے۔ وہ شکار پر فوراً پہنچ جاتا ہے اور اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے یا اس کا رُخ بدل دیتا ہے۔ لڑتا نہیں۔ کیونکہ لڑنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اتنی دیر میں دوسرے کتے پہنچ جاتے ہیں۔

تازی کتوں کے پیچھے دوسرے کتے بھی دوڑ پڑے اور ان کے پیچھے ہم دوڑے۔ زمین

ایسی تھی کہ کھڈ اور نشیب زیادہ تھے۔ ایسی زمین پر شکار کے پیچھے بھاگنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ ہم کھڈوں میں اُترتے اور چڑھتے چلے گئے۔ کتے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جب ہم نشیبی علاقے سے نکل کر اُوپر گئے تو کتے بہت دُور نکل گئے تھے مگر اب ان کے آگے گیدڑ نہیں بلکہ خرگوشوں کا جوڑا بھاگا جا رہا تھا جیسے کسی مداری نے ہمیں تماشا دکھایا ہو۔ ہمارے لیے ایک گیدڑ کے دو خرگوش بن جانا حیران کن نہیں تھا۔ گیدڑ کہیں اپنے سوراخ میں گھس گیا ہو گا اور کہیں قریب سے خرگوش اُٹھ دوڑے ہوں گے۔ گیدڑوں کے بل ایسے تنگ ہوتے ہیں جہاں کتا داخل نہیں ہو سکتا۔

خرگوش کی رفتار دیکھنے والی ہوتی ہے۔ ذرا جتنا خوبصورت جانور ہوا میں تیرتا لگتا ہے۔ تازی کتے اُن تک پہنچ گئے۔ خرگوشوں نے یک لخت بریکیں لگا دیں۔ وہ رک گئے۔ تازی کتے آگے نکل گئے۔ دوسرے کتے ابھی نہیں پہنچے تھے خرگوش دوسری سمت بھاگ اُٹھے۔ تمام کتوں کا رُخ اس طرف ہو گیا۔ خرگوش ایک بار پھر رُکے اور دوسری طرف بھاگ پڑے۔ کتے رُخ بدلتے بدلتے دُور آگے چلے گئے۔ جب وہ تعاقب کے لیے گھومے تو خرگوش خاصا فاصلہ حاصل کر چکے تھے۔ آگے دو پتھریلی پہاڑیوں کے درمیان راستہ تھا۔ خرگوش پہاڑیوں کے اندر چلے گئے۔

تھکن سے ہمارا حال بُرا ہونے لگا لیکن شکار کی لذت ہمیں دوڑاتی رہی اور ہم بھی پہاڑیوں کے اندر چلے گئے۔ دو فرلانگ دُور ہمیں خرگوش نظر آئے۔ کتے اُن پر پہنچنے ہی والے تھے کہ خرگوش یوں غائب ہو گئے جیسے انہیں زمین نے نگل لیا ہو۔ کتے بکھر گئے اور بڑی ہی بے تابی سے جھاڑیوں میں پنجے مارنے لگے۔ ہر کتا ایک چکر میں دوڑتا اور بھونکتا تھا۔ خرگوشوں کی بُو ابھی وہیں تھی جو کتوں کو چین نہیں لینے دیتی تھی۔ ہم سب

ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے اور سستانے لگے۔

اچانک کوئی تین سو گز دور آگے ہمیں دونوں خرگوش بھاگتے نظر آئے۔ وہ کہیں چھپ کر سستا چکے تھے۔ ایک لڑکے نے اُدھر دوڑ کر کتوں کی توجہ اس طرف کی لیکن صرف دو کتے بھاگے۔ انہوں نے خرگوشوں کو دیکھ لیا تھا۔ دوسرے کتے جھاڑیوں میں خرگوشوں کی بُو کی وجہ سے پنجے مار رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں دو اور کتے خرگوشوں کے پیچھے گئے اور پھر باقی سب اُدھر چلے گئے۔

ہم اتنا تھک چکے تھے کہ پاؤں پہ کھڑا ہونا محال تھا۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ درخت بہت تھے۔ میں دو ساتھیوں کے ساتھ ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اس طرح دو دو تین تین لڑکے الگ الگ درختوں تلے ہو گئے اور ایک لڑکا جانے کیوں کھڑا رہا۔ ہمیں دُور سے کتوں کے غرّانے اور بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے خرگوشوں کو پکڑ لیا ہے۔ ہمیں یہ لالچ تو نہیں تھا کہ کتے خرگوشوں کو پکڑ کر ہمارے حوالے کر دیں گے۔ گیارہ کتوں میں دو خرگوشوں کا ایک بال بھی حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ہم شکار کے نشے سے بدمست رہتے تھے۔ شکار کتے کھایا کرتے تھے۔

دُور سے گھٹا کی گرج سنائی دینے لگی اور ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ گھٹا کی گرج کے ساتھ کڑک بھی تھی۔ یہ بجلی کی کڑک تھی۔ ہم شدید طوفانِ باد و باراں کا انتظار کرنے لگے۔ پوٹھوہار میں کسی ویران علاقے میں بارش آ جائے تو راہ گیروں کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ لوگوں نے مٹی کی دیواروں جیسے ٹیلوں میں چھوٹی چھوٹی غاریں کھود رکھی ہیں جنہیں گُف کہتے ہیں۔ بارش تھمنے تک آپ کسی گُف میں بیٹھ جائیں۔ ہمیں گُفوں کا علم تھا۔ اس لیے طوفان کا کوئی ڈر نہ تھا۔

ہوا ٹھنڈی تھی۔ تھکن بہت زیادہ۔ میں لیٹا تو اونگھ آ گئی۔ میرے دوسرے ساتھی بھی نیم اونگھنے لگے تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ جو لڑکا کھڑا تھا وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ ہم سے وہ ذرا دُور تھا۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ اس کا جسم دُبلا تھا لیکن طاقت اتنی کہ اپنے سے دُگنے جسم کے آدمی کو کبڈی میں گرا لیتا تھا اور تازی کُتے کی طرح دوڑتا بہت تیز تھا۔ اس لیے ہم اسے موٹر کہا کرتے تھے۔ اور اس کا نام ہی موٹر پڑ گیا تھا۔ شرارتیں بہت کرتا تھا مگر اس کی ہر شرارت عجیب و غریب ہوتی تھی جن میں سے ایک یہ تھی کہ رمضان کے مہینے میں جب لوگ مسجد میں تراویح پڑھنے میں مصروف ہوتے تھے تو موٹر کبھی کبھار جا کر نمازیوں کی جوتیاں گڈمڈ کر آتا تھا۔ نماز کے بعد نمازی جب جوتیاں پہننے لگتے تھے تو موٹر تماشا دیکھا کرتا تھا۔ نمازی گالیاں دیتے تھے اور دیتے جلا کر اپنی اپنی جوتیوں کے دوسرے پاؤں ڈھونڈتے تھے۔ موٹر کا یہ راز آج فاش کر رہا ہوں — آج جب کہ نصف صدی بخور گئی ہے اور موٹر کو فوت ہوئے چھ سال گزر گئے ہیں۔ اللہ راجہ اللہ داد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ ہمارے کُتے خرگوشوں کے پیچھے چلے گئے تھے۔ ہم درختوں تلے اونگھ رہے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ کُتے واپس آ جائیں گے۔ موٹر جانے کیوں کھڑا تھا۔ ہم سے بارہ چودہ گز دُور تھا۔ اچانک ہمیں ایسی غراہٹ سنائی دی جو ہم نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس سے پہلے ہمیں کسی جانور کے دوڑنے کی ہلکی ہلکی آہٹ بھی سنائی دی تھی۔ غراہٹ کے ساتھ ہی موٹر کی سخت گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اُٹھو بھائی ادئے" — اور اس کی آواز دب گئی۔ اس میں صرف ایک سیکنڈ لگا ہو گا۔ ہم اُچھل کر اٹھے۔

اور جو کچھ ہمیں نظر آیا وہ یا تو ڈراؤنا خواب تھا یا یہ کوئی شرشار تھا۔ ہمیں ایک ریچھ نظر آیا جس نے موٹر کو پیچھے سے دبوچ لیا تھا اور اب موٹر نیچے اور ریچھ اوپر تھا۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ ریچھ انسان کو کھاتا ہے یا نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرف مارنے کے شوق سے انسان کو مار ڈالتا ہے۔ ہم نے ریچھ پالنے والے مداریوں کے پاس ریچھ دیکھے تھے، جنگل یا ویرانے میں ریچھ سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا نہ ہمارے علاقے میں کبھی جنگلی ریچھ دیکھا گیا تھا۔

یہ ریچھ بہت بڑا تھا۔ بہت ہی بڑا مگر ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ریچھ ہے۔ ہم اسے چڑیل سمجھ رہے تھے۔ دیہات میں چڑیلوں اور جنوں بھوتوں کے قصے سچ مانے جاتے تھے جن کے مطابق چڑیل حسین عورت کے روپ میں بھی نظر آتی ہے اور راہ گیروں کو ورغلا کر مار دیتی ہے اور کسی درندے کے روپ میں بھی سامنے آجاتی ہے اور کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔ کوئی انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنے جسم سے طاقت نکلتی ہوئی محسوس کی۔ دوسرے لڑکے بھی خوفزدہ ہو گئے مگر یہ خوف دو یا تین سیکنڈ رہا۔ ہماری مشکل یہ تھی کہ کتے دور چلے گئے تھے۔ ہمارا ایک دلیر اور بڑا ہی پیارا ساتھی ریچھ کے نیچے پڑا تھا۔ جانے کس کی آواز سنائی دی "پے جاؤ ڈنڈے" — اور ہمارا ایک ساتھی افضل جس کے ہاتھ میں چاقو تھا ایک ہی جست میں پہنچا اور چاقو ریچھ کی پیٹھ میں اتار دیا۔ ریچھ غرا کر اٹھا اور افضل کی طرف گیا۔ موٹر گیند کی طرح اچھلا۔ اس کی قمیض آگے سے پھٹ گئی اور خون سے سرخ ہو گئی تھی۔ ریچھ نے بڑے گہرے پنجے اتارے تھے۔

آفرین صد آفرین! موٹر اتنے گہرے زخم کھا کر گیند کی طرح اچھلا اور جب ریچھ

افضل کی طرف جا رہا تھا اور افضل پیچھے ہٹ رہا تھا موٹر تیز دوڑا اور پانی میں غوطہ لگانے کی طرح ریچھ کے اوپر گیا اور ریچھ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ ریچھ رک گیا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ موٹر نے اس کی گردن کے گرد بازو لپیٹ رکھا تھا۔ ریچھ بہت بڑا تھا۔ اس نے زور سے جسم کو جھٹکا دیا تو موٹر اس طرح دور جا پڑا جیسے کسی نے پتھر پھینکا ہو۔ ریچھ اس کی طرف دوڑا۔ ہمارے ہاتھوں میں کتوں کی زنجیریں تھیں۔ وہ دوڑ کر کے اس کے سر پر آیا۔ ریچھ گھوما اور میری طرف آیا۔ میں پیچھے ہٹا مگر ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ ریچھ میرے اوپر آگیا۔ میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

ریچھ نے پنجے اٹھائے ہی تھے کہ میرے ایک اور ساتھی اکرم نے چاقو اس کی پیٹھ میں اتار دیا۔ ریچھ گھوم گیا اور وہ گھوما ہی تھا کہ موٹر پھر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور ایک ہاتھ اس کے نیچے والے جبڑے میں اور دوسرا اوپر والے جبڑے میں رکھ کر اس کا منہ کھولنے لگا لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ ریچھ نے منہ بند کر لیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر موٹر کو دیکھا اس کے دانت جڑ گئے تھے اور درد سے اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔

دو لڑکوں نے آگے ہو کر ریچھ کی پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں اور دائیں بائیں پوری طاقت سے کھینچیں۔ یہ ریچھ نے دانتوں کا شکنجہ ڈھیلا کر دیا۔ موٹر کے ہاتھ اس کے منہ سے نکل آئے جن سے خون ٹپک رہا تھا — ہماری ٹیم کی بہادری یہ تھی کہ ہم ریچھ کی عادتوں، اس کی طاقت اور اس کی خونخواری سے بالکل واقف نہیں تھے۔ اس کے متعلق عجیب و غریب اور بہت ڈراؤنی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ہم پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے اس کا مقابلہ شروع کر دیا۔ یہی وہ جذبہ ہے جو آجکل کے نوجوانوں کو بتانے کے لیے یہ کہانیاں سنا رہا ہوں۔ مسلمان کے بچے میں خوف کے نام کی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیئے۔

جونہی ہم نے موٹر کے ہاتھ ریچھ کے دانتوں سے آزاد کرائے ہمارے کتے آ گئے۔ موٹر پہلے ہی زخمی تھا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ بھی کچلے گئے۔ پھر بھی اس نے اپنے زخموں کی کوئی پرواہ نہ کی اور ریچھ پر جھپٹنے کے لیے اس کے اردگرد دوڑنے لگا۔ میں گر کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں کتے آ گئے۔ ان میں افغان کا بوبا خونخوار کتا تھا۔ آتے ہی اس نے ریچھ پر حملہ کیا۔ اس کا سٹائل یہ ہوتا تھا کہ شکار پر جھپٹ کر اوپر سے اس کا گردن نہیں لیتا تھا اور دانت گاڑ کر ایسا جھٹکا دیتا تھا کہ شکار کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔ ریچھ پر بھی وہ یہی داؤ کھیلنا چاہتا تھا مگر ریچھ کے بال بہت گھنے تھے اور گردن پر اور طرح کی تھی جو بوبی کے لیے نئی تھی۔ دوسرے کتے حملہ آور ہونے ہی لگے تھے کہ ریچھ نے اپنی بے پناہ طاقت کے زور سے بوبی کو پرے پھینک دیا۔ ہم موٹر کی طرف متوجہ ہوئے لیکن وہ پاگلوں کی طرح ریچھ پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتا تھا۔ اب اس کے سارے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔ اس کی سب سے زیادہ دلیری تو یہ تھی کہ ریچھ نے پیچھے سے دبوچ لیا اور اس کے جسم میں نیچے گاڑ کر اسے گرا لیا تھا۔ آج کا کوئی نوجوان ہوتا تو اس اچانک حملے سے ہی اس کی حرکت قلب بند ہو جاتی۔ ریچھ کا حملہ اس کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ پھر بھی اس نے حوصلہ قائم اور دماغ حاضر رکھا۔

ریچھ کتوں کے نرغے میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیٹھ سے خون ٹپکنے لگا تھا۔ وہ اس قدر بپھرا ہوا تھا کہ اس میں بلا کی تیزی آ گئی تھی جس طرف سے کوئی کتا آگے بڑھتا تھا وہ اُدھر منہ کر کے کتے کا حملہ بیکار کر دیتا تھا۔ ایک بُوگیر کتا اس کی زد میں آ گیا۔ ریچھ نے اس کے سر پر پنجہ مارا تو اس کا سر جسم سے کٹ کر دُور جا پڑا۔ یہ دیکھ کر کتے ڈر گئے اور اس کے قریب جانے سے گھبرانے لگے مگر بوبی نے پہلو کی طرف سے آ کر ایک پنجہ پیٹ میں اور دوسرا پیٹھ میں ڈال کر اس کے پہلو میں دانت گاڑ دیے۔ ریچھ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا تھا اور اگلا پنجہ کھا کر اسے لپیٹ میں لینے کی

کوشش کر رہا تھا لیکن بوبی نے ایسے دانت گاڑے کہ ریچھ بے بس ہو گیا۔ وہ ایک ہی جگہ گھومنے لگا۔ بوبی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

تین کتوں نے بیک وقت اس کی پچھلی ٹانگوں کو منہ میں لے لیا۔ اب کے ریچھ نے ایسا زور لگایا کہ چاروں کتوں سے آزاد ہو گیا۔ ہم سب دُور کھڑے رہے۔ کتے اب پوری طرح غصے میں آ گئے تھے۔ وہ اُٹھ کر پھر ریچھ کی طرف آئے لیکن ریچھ جس کے جسم سے اب خون بہنے لگا تھا۔ ہر طرف سے چوکس تھا اور اس نے پنجے خنجروں کی طرح نکال رکھے تھے۔ اچانک ہمیں ایک گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ یہ آواز بھی "ہٹ جاؤ۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔ کتے ہٹا لو" — ہم نے دیکھا کہ ایک دیہاتی آدمی ہاتھ میں نیزہ تھامے گھوڑے کو سرپٹ بھگائے آ رہا تھا۔ ہم اس کے راستے سے ہٹ گئے مگر کتے نہ ہٹے۔ اُس نے پھر کہا۔ "کتوں کو ہٹاؤ" — گھوڑا بہت ہی تیز تھا۔ پلک جھپکتے ہمارے قریب آ گیا۔ سوار نے ایک ہاتھ میں نیزہ تھام کر آگے کر رکھا تھا۔ وہ ریچھ کو مارنا چاہتا تھا۔

کتے اس کے راستے میں تھے۔ سوار نے پروانہ کی اور کتوں کے درمیان سے گزرتا نیزہ پوری طاقت سے ریچھ کی پیٹھ میں اتار دیا۔ ہمارا ایک تازی کتا گھوڑے کی لپیٹ میں آ گیا اور دُور جا پڑا۔ پھر اُٹھ نہ سکا۔ ذرا سا تڑپا اور مر گیا۔ ریچھ گھوڑے کے ساتھ گیا۔ سوار نے اس کے جسم سے نیزہ نکال لیا۔ ریچھ نے دو تین لڑھکنیاں کھائیں اور اُٹھا۔ سوار نے آگے جا کر گھوڑا گھمایا اور پہلے کی سی رفتار سے آیا۔ اُس وقت بوبی ریچھ کی پیٹھ پر سوار تھا۔ ریچھ پچھلی ٹانگوں پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کا پیٹ سوار کی طرف تھا۔ سوار نے قریب سے گزرتے نیزہ بڑی زور سے اس کے پیٹ میں اُتار دیا مگر نیزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ریچھ کے پیٹ میں اترا رہا۔

اس کے گرنے سے بوہلی اس کے نیچے آگیا۔ موٹر نے دوڑ کر نیزہ پکڑ لیا اور اسے دبا کر اور زیادہ پیٹ میں اُتار دیا۔ بوہلی نیچے سے نکل آیا اور اوپر سے ریچھ کی گردن دانتوں میں لے لی۔ ریچھ نے اسے بہت پنجے مارے لیکن بوہلی نے اس کی شہ رگ چیر پھاڑ دی اور ریچھ بے جان ہونے لگا اور تھوڑی دیر بعد بالکل ہی بے حس ہوگیا۔ تب ہم نے دیکھا کہ اس کی ناک میں لوہے کا کڑا اور کڑے میں چار پانچ انچ رسّی تھی جو لٹکتی ہوئی تھی۔ یہ بندر اور ریچھ کا تماشا دکھانے والوں کا ریچھ تھا۔

ہم سب موٹر کے زخم دیکھنے لگے۔ اس کے سینے سے کھال اُتر گئی تھی۔ پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک کندھے سے گوشت لٹک رہا تھا۔ بازو بھی چھیلے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چبائی ہوئی تھیں لیکن وہ ہنس رہا تھا۔ ہم نے پگڑیاں اتار کر اس کے زخموں پر باندھیں۔

اس دوران سوار نے ہمیں بتایا کہ یہ ریچھ سوہاوا سے بھاگا تھا۔ سوہاوا جہلم اور راولپنڈی کے تقریباً درمیان میں ایک بڑا گاؤں ہے۔ جی ٹی روڈ پر واقع ہے اور یہ ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ ریچھ والا تماشا دکھا رہا تھا اور وہ ریچھ سے کشتی کر رہا تھا۔ اسے شاید ریچھ والا مار بیٹھا۔ یہ غصّے میں آگیا۔ اس نے رسّی تڑوا لی اور بھاگ اُٹھا۔ ریچھ والا اس کے پیچھے دوڑا۔ ریچھ نے رُک کر اپنے مالک کو دبوچ لیا۔ کوئی بھی چھڑانے کی جرأت نہ کر سکا۔ ریچھ نے اسے جان سے ایسا مارا کہ اس کے جسم کو چیر پھاڑ دیا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہمارے گاؤں کے ایک صوبیدار صاحب نے یہ قصہ اپنی پلٹن کے ایک انگریز افسر کو سُنایا تھا۔ صوبیدار صاحب نے ہمیں بتایا کہ اس انگریز نے فوراً پوچھا تھا کہ جس وقت ریچھ والا ریچھ سے کشتی کا تماشا دکھا رہا تھا اس وقت بجلی تو نہیں چمکی تھی؟ صوبیدار

صاحب کو ہم نے بتایا تھا کہ اُس وقت بادل گرج رہے تھے۔ انگریز نے انہیں بتایا کہ درندے کالی گھٹا کی چمکتی اور کڑکتی ہوئی بجلی سے ڈرتے ہیں۔ ببر شیر بھی ڈرتا ہے۔ اس ڈر سے وہ اگر جنگل میں ہوں تو اپنی کچھاروں میں چھپ جاتے ہیں اور اگر پنجرے میں بند ہوں تو غصّے اور ڈر سے غراتے ہیں۔ مداری پر ریچھ نے اسی لیے حملہ کیا تھا کہ بجلی کوند رہی تھی اور مداری نے اس کی ناک میں رسّی ڈال رکھی تھی اس لیے ریچھ نے اس سے آزاد ہونے کے لیے اس پر حملہ کیا تھا۔

ہُوا بھی ایسے ہی تھا کہ جیسا میں آپ کو سُنا چکا ہوں، مغرب سے گھٹا گرجتی آ رہی تھی اور ریچھ بہت تیزی سے بھاگا آ رہا تھا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ مداری نے ریچھ کے پنجے ناخن رگڑے ہوئے تھے۔ اگر وہ قدرتی طریقے سے پورے ہوتے تو سب کو چیر پھاڑ دیتا۔

یہ سوار کہیں سے گھوڑے پر آ رہا تھا۔ وہ اُس وقت وہاں پہنچا جہاں مداری تماشا دکھا چکا تھا۔ اور جب ریچھ غائب ہو چکا تھا اور ریچھ والے کی لاش خون میں ڈوبی ہوئی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ سوار کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ اُس زمانے میں گھوڑا سواری اور نیزہ بازی پولو ٹھوارکا محبوب مشغلہ تھا۔ بڑے زبردست گھوڑے پالے جاتے تھے۔ سوار کو جب پتہ چلا کہ ریچھ فلاں طرف بھاگ گیا ہے تو اسے خیال آیا کہ راستے میں وہ لوگوں کو بھی مارے گا۔ اس نے گھوڑا اس کے پیچھے دوڑایا۔ ایک میل دُور اُسے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ ان کے درمیان گائے کا ایک بچھڑا مرا پڑا تھا۔ اسے ریچھ مار گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسے بتایا کہ ریچھ کس طرف گیا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ ریچھ بہت تیز دوڑتا آیا تھا ورنہ وہ اتنی جلدی اتنی دُور نہ پہنچتا۔ سوار گھوڑا دوڑاتا گیا اور راستے میں ہل چلاتے کسانوں سے اس نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ریچھ

اس طرف جاتا دیکھا ہے۔ اس طرح یہ سوار ہم تک پہنچا اور اسے ریچھ نظر آگیا۔

سوار نے ہم سے ہمارا گاؤں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ تو بہت دُور ہے۔ اُس نے موٹر کو گھوڑے پر بٹھایا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ کر ہمیں کہا کہ مَیں اسے گوجر خان ہسپتال میں لے جا رہا ہوں اور وہ گھوڑا بھگا لے گیا۔ وہاں سے گوجر خان بارہ میل دُور تھا اور اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک لڑکا گاؤں جا کر اطلاع دے اور باقی سب پیدل گوجر خان چلیں۔ بہرحال تین لڑکے کُتوں کو ساتھ لیے گاؤں کو چلے گئے اور ہم بارہ میل کے سفر پر برستی بارش میں چل پڑے۔ تین لڑکوں پر راستے میں جو گزری وہ اسی کتاب میں پڑھ لیجیے۔ حادثے کے بعد ایک اور حادثہ ہوگیا۔ راستے میں انہیں دو میلاں کس عبور کرنے پڑے۔ ایک کُتا ڈوب گیا اور اسے بچاتے بچاتے ہمارا ایک ساتھی ایسے مقام پر بھٹور میں پھنس گیا جہاں دو کس ملتے تھے۔

ہم جب پاپیادہ گوجر خان سول ہسپتال میں پہنچے تو موٹر کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر ہندو تھا۔ اس نے کہا کہ خون کی ضرورت ہے۔ ہم سب نے خون دیا اور موٹر بچ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن بھی لگائے تھے کہتا تھا کہ ریچھ باولا نہ ہو۔

ہم رات ہسپتال کے برآمدے میں لیٹ گئے۔ آدھی رات کے وقت ہمارے گاؤں کی آدھی آبادی گوجر خان پہنچ گئی۔ مردوں نے تو کچھ نہ کہا۔ عورتوں نے ہمارا جو حشر کیا، وہ الگ کہانی ہے۔ کوئی ایک مہینہ بعد ہم سب کی مائیں ایک بار پھر منڈیر یوں پر کھڑی اور بعض دروازوں میں کھڑی باری دلہا لہرا لہرا کر ہمیں شکار پر رخصت کر رہی تھیں۔ ان میں موٹر کی ماں کی آواز سب سے اونچی تھی۔ اس کی آخری آواز جو ہم نے سنی، یہ تھی۔

"آج تُو آ واپس۔ مَیں تیرا کلیجہ انہی کُتوں کو کھلاؤں گی۔ پہلے تجھے ریچھ نے کھایا تھا آج

تجھے بندر کھائیں گے۔ تُو آ لے واپس" —— اور موٹر جو اتنے گہرے زخموں سے بچ نکلا اور اب اچھا بھلا ہمارے ساتھ جا رہا تھا، ہنس رہا تھا۔ اس نے کہا:

"میری ماں جس روز میرا کلیجہ کُتوں کو کھلانے کی دھمکی دیتی ہے اُس رات دُودھ میں گھی ڈال کر ضرور پلاتی ہے۔"

نمازِ جنازہ پڑھی جا چکی تھی

ہمارا عزیز دوست اپنے کُتے کی خاطر سیلاب میں ڈوب گیا۔ لاش نہ ملی۔ نمازِ جنازہ پڑھ لی گئی پھر ایک ایسے منظر سے پردہ اٹھا جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔

میری

کہانی "پوٹھوہار میں ریچھ کہاں" گوجر خان ہسپتال میں پہنچ کر بھی ختم نہ ہوئی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ جن ساتھیوں کو ہم نے گاؤں اطلاع دینے کے لیے بھیجا ہے، ان میں سے ایک سیلاب میں بہہ گیا ہے اور گاؤں میں ایک نئی کہانی چل پڑی ہے۔

جس وقت ہمارے یہ تین ساتھی گاؤں کی طرف اور ہم گوجر خان ہسپتال کی طرف چلے تھے، اُس وقت ساون کا مہینہ برس رہا تھا۔ موسم بہت ہی دل کش تھا کیوں کہ اُس وقت میں نوجوان تھا۔ آندھیاں، طوفان، بارشیں اور سیلاب میرا اور میرے ساتھیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ساون کی بارش برسا کرتی تھی تو برساتی نالے چڑھ جایا کرتے تھے۔ ان نالوں کو ہمارے ہاں "کس" یا "کسی" کہا جاتا ہے۔ ان میں سیلاب آجایا کرتا

تھا اور ہم مٹی کے اونچے سے اونچے ٹیلوں سے اس سیلاب میں چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ ان کسّوں میں کچھ خطرات بھی تھے۔ اب تو چھوٹے چھوٹے ڈیم بنا کر ان کسّوں کا جوش و خروش ہی ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ تو خوشی والی بات ہے کہ ملک ترقی کر گیا ہے مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے کسّوں کے آگے بند باندھ کر انہیں بے بس کر دیا گیا ہے تو افسوس بھی ہوتا ہے۔ افسوس اس لیے ہوتا ہے کہ ہمارے بچپن اور جوانی کی ہنگامہ پرا یادوں کے آگے بند بندھ گئے ہیں۔ جب بند نہیں بندھے تھے تو ساون میں یہ کس ڈاکٹر اقبال علیہ رحمۃ کے اس شعر کی تفسیر بن جاتے تھے ـــــ رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ۔ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ۔

ان کسّوں میں خطرہ یہ ہوتا تھا کہ بہت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جا کر مڑ جاتے تھے اور جہاں نوّے یا اس سے بھی کم درجے کے زاویے سے مڑتے تھے وہاں نامی گرامی تیراک بھی ہار کر ڈوب جاتے تھے۔ ان کا رخ مٹی کے ایک سو سے دو سو فٹ بلند دیوار کی طرح عمودی ٹیلے روک کر موڑتے تھے۔ بعض جگہوں پر ایک کس کے ساتھ دوسرا کس آملتا تھا اور اس مقام پر دو سیلابوں کے ٹکرانے سے ایسی حالت پیدا ہو جاتی تھی اور ایسے خوفناک بھنور اُٹھتے تھے کہ انجن والی کشتی بھی نہ نکل سکے۔

اِن کسّوں میں ایک اور بے حد خوفناک خطرہ تھا۔ وہ تھیں چٹانیں جو کئی کسّوں کے وسط میں ہوتی تھیں یا ایسی جگہ جہاں کنارا مڑتا تھا۔ یہ چٹانیں اب بھی وہاں کھڑی ہیں لیکن کسّوں میں سیلاب نہیں آتا کیونکہ جگہ جگہ بند باندھ دیئے گئے ہیں۔ یہ چٹانیں سلوں کی بھی ہیں اور سخت قسم کی ریت کی بھی۔ ان سے پانی ٹکرا کر گھومتا جایا کرتا تھا مگر پانی اندر ہی اندر انہیں کاٹتا رہتا تھا جس سے پانی میں چھپی ہوئی غاریں بن گئی تھیں۔ بعض

اوقات لوگ شوقیہ سیلاب میں تیرا کرتے تھے۔ کئی بار یوں ہُوا کہ کوئی آدمی پانی کے زور سے کسی چٹان سے ٹکرایا اور پانی نے اسے آبدوز غار میں دھکیل دیا۔ وہاں جا کر کوئی آدمی کبھی نہیں نکل سکا تھا۔ لاش بھی نہیں ملتی تھی۔ سیلاب اسے غار کے اندر ہی دیواروں سے پٹخ پٹخ کر لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا اور غائب کر دیتا تھا۔

ہمارے تین دوستوں میں سے ایک جنہیں ہم نے گاؤں بھیجا تھا، ایسے ہی ایک سیلابی کس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو کُتے تھے جن میں سے ایک بھیڑیئے کی نسل کا تھا۔ بہت تیز اور دلیر کُتا تھا جس کا نام ٹرو تھا۔ ریچھ کے ساتھ اس نے بڑی دلیری سے معرکہ لڑا تھا۔ یہ ہماری ٹیم کے لیڈر کُتوں میں سے تھا۔ بُوہلی کے بعد ٹیم پر اسی کی حکمرانی تھی۔ اگر ہمیں ذرا بھی اشارہ مل جاتا کہ وہ ریچھ سے لڑ کر اپنے مالک کی زندگی کے لیے آخری معرکہ لڑنے جا رہا ہے تو ہم اپنے دوست کو کہتے کہ اپنا کُتا ہمارے ساتھ رہنے دے اور وہ خود چلا جاتے مگر ہمارا کوئی دوست اپنے کُتے سے کبھی الگ نہیں ہُوا تھا اور اس کُتے نے ثابت کر دیا کہ کُتا اپنے مالک سے جان کی قیمت دے کر بھی الگ نہیں ہوتا۔

ٹرُو کا آخری کارنامہ سنانے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کُتا ہمارے دوست کو ملا کہاں سے تھا۔ یہ دُودھ پیتا پلّا تھا۔ عمر شاید تین چار دن ہوگی۔ گاؤں سے دُور ایک کھڈ میں پڑا سسک رہا تھا۔ اس کی ابھی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔ بھوک سے مر رہا تھا۔ میرا دوست کسی گاؤں سے اپنے گاؤں کو آ رہا تھا کہ راستے میں اسے یہ پلّا کھڈ میں سسکتا ملا۔ اس کی ماں کو کہیں قریب ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے دوست نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے ایک ٹیلے میں ایک تنگ سی گُفا نظر آئی۔ اندر جھانک

کے دیکھا تو اسے ایک پلّے کی ایک ٹانگ پڑی نظر آئی۔ باہر اسے خون کے دھبے دکھائی دیئے اور تھوڑی دُور اسے کُتیا کی اَدھ کھائی لاش پڑی ملی۔ یہ بھیڑیوں کی کارستانی ہو سکتی تھی۔ بھیڑیئے پلّوں کو اٹھانے آتے ہوں گے اور انہیں بچاتے بچاتے ماں بھی ماری گئی اور کھائی گئی۔

ٹرو کے بچنے کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس کی ماں بھیڑیوں سے اُلجھ گئی ہوگی اور یہ پلّا بچ گیا ہوگا۔ پھر بھیڑیئے اس کے بہن بھائیوں اور ماں کو کھا کر چلے گئے ہوں گے۔ ہمارا دوست پلّے کو اُٹھا لایا اور اسے دُودھ پلانے لگا۔ پلّا بچ گیا۔ اسے اپنی ماں کا دُودھ اور پیار نصیب نہیں ہُوا تھا۔ اسے ایک انسان سے پیار ملا۔ اسی کو وہ اپنا سب کچھ سمجھنے لگا ہر کُتے کی فطرت ہے کہ وہ انسان کا وفادار ہوتا ہے لیکن ٹرو انسانوں کے ساتھ غیر معمولی پیار کرتا تھا۔ گاؤں کے ہر ایک فرد سے خواہ وہ بچہ ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت وہ دُم ہلا کر اور ان کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑ کر پیار کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اپنے مالک کے ساتھ پیار کا یہ عالم تھا کہ رات اس کی چارپائی کے نیچے سویا کرتا تھا۔ سردیوں میں اندر اور گرمیوں میں باہر۔

اور جب وہ جوان ہُوا تو اوّل درجے کا شکاری اور خونخوار نکلا۔ دیکھنے میں بھیڑیا ہی لگتا تھا۔ مگر وہ جوانی کے عالم میں مالک کی نیکی کا صلہ دے کر مر گیا۔ ہم نے اس کے مالک اور اپنے دو ساتھیوں کو گاؤں بھیجا کہ اطلاع دے دیں کہ "موٹر" شکار پر زخمی ہو گیا ہے اور ہم اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں جو وہاں سے بارہ میل دُور تھا۔ ہسپتال میں جب ہمارے گاؤں کے لوگ آئے تو اُن سے اطلاع ملی کہ ٹرو سیلاب میں ڈوب گیا ہے اور اس کے مالک کا کوئی پتہ نہیں۔ شاید وہ بھی ڈوب گیا ہے۔ جب ہمیں بتایا گیا کہ وہ کون سے کس میں اور کہاں

ڈوبے تھے تو ہم نے ان کے بچ نکلنے کی امیدیں ختم کر ڈالیں۔ وہاں سے کبھی کوئی نہیں نکل سکا تھا۔

بعد میں ہمیں ساری تفصیل کا پتہ چلا۔ وہ اس طرح ہے کہ ساون کی بارش برس رہی تھی۔ اوپر پہاڑیوں میں یعنی جدھر سے سارے کس شروع ہوتے ہیں، شاید بہت ہی زیادہ بارش ہوئی تھی۔ جب ہمارے تین ساتھی ایک کس میں پہنچے تو اس میں ٹخنوں سے ذرا اوپر پانی تھا۔ قریب ہی کس کا موڑ تھا اور اس کا ایک کنارا دیوار کی طرح عمودی کوئی ساٹھ سترفٹ بلند تھا۔ ہمارے ساتھیوں کو کس پار کر کے دیوار جیسے کنارے کے دامن میں کس کے ساتھ ساتھ چلنا اور خاصا آگے جا کر اوپر چڑھنا تھا۔

وہ کس کے درمیان میں تھے کہ اچانک سیلاب آگیا۔ ہمارے علاقے کے کسوں میں سیلاب آہستہ آہستہ نہیں بلکہ نہایت تیزی سے آجاتا ہے اور جہاں پاٹ تنگ اور کنارے بلند ہوتے تھے وہیں سیلاب گہرا اور تیز ہوتا تھا بھینس جیسے وزنی اور طاقتور جانور کو یہ سیلاب سنبھلنے نہیں دیتا تھا اور بہا لے جاتا تھا۔ ہمارے کسوں میں ایسے حادثے اکثر ہوا کرتے تھے۔ یہی حادثہ ہمارے ایک ساتھی سے ہوا۔ دو ساتھی اور ایک کتا سامنے والے کنارے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ٹرو بھی آگے نکل گیا تھا۔ اس کا مالک ابھی پیچھے تھا۔ وہ وسط میں پہنچا تو کس کے موڑ کی وجہ سے دیکھ نہ سکا کہ سیلاب آرہا ہے۔ ہمارے دوسرے ساتھیوں نے بتایا کہ اچانک سیلاب ایک پہاڑ کی طرح آگیا۔ بالکل ایسے جیسے کئی ایک لمبیں پہلو بہ پہلو اکٹھی پوری رفتار سے چلی آرہی ہوں۔

ٹرو کا مالک گھبرا گیا۔ وہ رک گیا۔ اس نے پیچھے بھی دیکھا اور سامنے بھی اور وہ آگے کو یعنی دوسرے کنارے کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اس کے ساتھی دوڑ کر آگے چلے

گئے۔ تھوڑا ہی آگے ڈھلان تھی، جہاں سے لوگ اوپر چڑھتے اور اترتے تھے۔ وہ ڈھلان پر چڑھ گئے۔ ان کے ساتھ ایک کتا تھا۔ وہ اپنے مالک کے پیچھے دوڑا اور ٹرو اس کتے کو دیکھ کر شاید اس خیال سے اس کے پیچھے دوڑ پڑا کہ کوئی شکار ہے۔ ٹرو کے مالک کو سیلاب نے کنارے پر دبوچ لیا اور اپنے ساتھ بہانے لگا۔ اس کے ساتھی تو ڈھلان پر چڑھ گئے تھے۔ جب ٹرو کا مالک سیلاب میں بہتا ڈھلان کے قریب سے گزرا تو اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھ لیا۔ بارش برس رہی تھی جس سے ڈھلان پر پھسلن تھی۔ اگر اس کا کوئی ساتھی پھسل جاتا تو سیدھا سیلاب میں جا پڑتا۔ لہٰذا وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

اُس نے زور تو بہت لگایا۔ وہ تیر سکتا تھا مگر سیلاب نے اسے کنارے تک نہ جانے دیا۔ آگے جا کر دونوں کنارے عمودی ہو گئے اور پاٹ تنگ۔ اس سے پانی زیادہ گہرا ہو گیا اور تیز بھی۔ اس کے کتے ٹرو نے اسے دیکھ لیا۔ ہمارے ساتھیوں نے بتایا کہ ٹرو بے تابی سے بھونکا۔ اُس وقت وہ ڈھلان کے اوپر جا چکا تھا۔ وہ اوپر ہی اوپر ساٹھ سترفٹ بلند کنارے پر دوڑا اور ایک جگہ رُک کر اس نے سیلاب میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا مالک آگے نکل گیا تھا۔ وہ ڈوب نہیں رہا تھا۔ تیرتا جا رہا تھا۔ سیلاب اسے نیچے کو دبا رہا تھا۔ لیکن وہ پوری طاقت صرف کر کے ڈوبنے سے بچ رہا تھا۔

ٹرو نے ڈبکیاں کھائیں لیکن ابھر کر بھونکنے اور تیرنے لگا۔ وہ اپنے مالک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا مالک دُور نہیں تھا۔ اس نے اپنے کتے کو دیکھ لیا اور اس کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر سیلاب کتے کو دُور لے گیا اور اس کا مالک اپنے آپ کو بچانے کی بجائے اسے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ کتا بھونکتا تھا اور اس کا

مالک ٹرو ٹرو پکار رہا تھا۔ آگے کس کا ایک اور موڑ تھا اور کنارے ایسے کہ ہمارے جو ساتھی اوپر تھے وہ بلندی اور خطرناک کیچڑ اور پھسلن کی وجہ سے نیچے نہیں آسکتے تھے نہ کوئی مدد کرنے کے قابل تھے بلکہ اس موڑ پر ٹرو اور اس کا مالک ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ آگے جا کر کس کا پاٹ چوڑا ہو جائے گا اور سیلاب کا زور پھیل جانے سے کُتا اور اس کا مالک بھی نکل آئے گا۔

یہ پیشِ نظر رکھیے کہ یہ کوئی میدانی ندی نالہ نہیں تھا جس کے کنارے ایک ہی جیسے اور ذرا ذرا اونچے تھے۔ یہ پہاڑی علاقے کا نالہ تھا جس کے کنارے مٹی اور پتھر کے ٹیلے تھے اور اونچے تھے ایسے نالے میں بستے ہوئے آدمی کو دُور اوپر سے یا کسی طرف سے کوئی مدد نہیں دی جا سکتی اور جس مقام پر ٹرو اور اس کا مالک سیلاب کی لپیٹ میں آئے تھے وہ تو بہت ہی خطرناک مقام تھا کیونکہ مٹی اور پتھروں کے ٹیلوں سے گھرا ہُوا تھا۔ اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کس مڑ جاتا تھا۔ ہمارے ساتھی کنارے پر اوپر ہی اوپر دوڑ رہے۔ اوپر کھیتیاں تھیں جن کا کیچڑ انہیں چلنے نہیں دیتا تھا۔ تین چار جگہوں پر ٹرو اور اس کا مالک ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

انہیں یہ اطمینان تھا کہ آگے کہیں تو جا کر پاٹ چوڑا ہو گا مگر گھبراہٹ میں انہیں یاد نہیں رہا تھا کہ اصل خطرے کا مقام تو آگے آ رہا ہے۔ آگے ایک اور کس جو اس سے زیادہ بڑا تھا اس کس سے آ ملتا تھا اور یہیں پر موڑ تھا اور وہاں پاٹ بہت ہی تنگ تھا۔ یہ جگہ ڈیڑھ دو سو گز دُور رہ گئی تھی۔ ہمارے کنارے والے ساتھیوں نے دیکھا کہ کُتا اور مالک اکٹھے ہو گئے تھے۔ کُتا ذرا دُور تھا اور اپنے مالک کی طرف جانے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مالک نے پہاڑ کی طرف تیر کر اسے پکڑ لیا اور

کندھے پر بٹھا لیا۔ پھر خود تیرنے لگا مگر کُتا بے تاب تھا جیسے وہ مالک کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اس کے کندھے سے اُتر گیا اور مالک کے ساتھ لپٹنے لگا۔ اس کے بعد دونوں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے کیونکہ ہمارے ساتھیوں کے سامنے ایک گہری کھائی آ گئی تھی۔

وہ اس کھائی سے گھوم کر آگے گئے تو سیلاب کا شور انہیں اس طرح سنائی دینے لگا جیسے بہت سے طیارے ان کے سروں پر اُڑ رہے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کی آواز بھی نہیں سُن سکتے تھے۔ وہ حیران ہوتے کہ سیلاب کا شور یک لخت کیوں بڑھ گیا ہے۔ جب وہ آگے گئے تو ٹھٹھک کر رُک گئے کیونکہ وہ ایک اور عمودی ٹیلے کی چوٹی پر بلکہ منڈیر پر کھڑے تھے اور ان سے تقریباً پندرہ سولہ گز نیچے ایک اور سیلابی کس بہ رہا تھا۔ تب انہیں ہوش آئی کہ وہ کہاں ہیں اور ان کا ساتھی اور ٹرو کا اب کیا حشر ہو گا۔ ہمارے ان ساتھیوں کو اس کس نے روک لیا۔ آگے جانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ انہیں دونوں کسوں کے ٹکرانے اور مل کر ٹیلوں کی تنگی میں قیامت بپا کرنے کا شور سنائی دے رہا تھا جس نے ان کے رنگ فق کر دیئے اور وہ اپنے گاؤں کی طرف دوڑے۔

گاؤں میں انہوں نے دو تشویشناک اطلاعیں دیں۔ ایک یہ کہ موٹر کو ریچھ نے زخمی کر دیا ہے اور ٹرو کے مالک کو سیلاب بہا لے گیا ہے۔ موٹر کے گھر والے اور عزیز رشتہ دار گوجر خان کی طرف بھاگ اُٹھے اور ٹرو کے مالک کے لواحقین کس کی اُس سمت بھاگے جس طرف وہ بہ گیا تھا۔ ہمارے ساتھی بتاتے ہیں کہ بڑا ہی اندوہناک منظر تھا۔ مائیں اور بہنیں سروں سے دوپٹے اتارے، کیچڑ میں دھنستی ہوئی چیختی چلاتی اور بَین کرتی بھاگی جا رہی تھیں۔ وہ زمانہ سائیکلوں اور سکوٹروں کا نہیں، گھوڑوں کا تھا۔ ہمارے

گاؤں میں چودہ گھوڑے گھوڑیاں تھیں۔ گدھے گدھیاں تو بہت ساری تھیں۔ باربرداری کا ذریعہ گدھیاں اور اونٹ ہی تھا۔ اس ترقی کے دور میں بھی ہمارے دیہات کا بیشتر حصہ گدھوں اور اونٹوں کو استعمال کرتا ہے۔

گاؤں والوں کے پاس سواری کا جو بھی جانور تھا، انہوں نے پیش کر دیا۔ پیدل دوڑتی عورتوں کو گھوڑیوں پر بٹھایا، مرد گدھیوں پر سوار ہو گئے۔ تین اونٹ تھے، تین تین آدمی ان پر چڑھ بیٹھے اور باقی پیدل چل پڑے۔ وہ محبت اور خلوص کا زمانہ تھا۔ گاؤں کا کوئی ایک بھی مرد گاؤں میں نہ رہا۔ کچھ لوگ ہسپتال کی طرف گئے اور باقی کس کے بہاؤ کی طرف۔ مگر دونوں کسوں نے ان کے راستے روک رکھے تھے۔ وہ کسوں کا چوڑا پاٹ ڈھونڈنے لگے جہاں سے پار جایا جا سکتا تھا۔ ایسے پاٹ انہیں مل تو گئے لیکن فاصلے بڑے بے ہو گئے۔ بارش کا زور تھم رہا تھا۔

ہسپتال پہنچنے والوں کو تین کس عبور کرنے پڑے اور جو لوگ ٹرک کے مالک کو ڈھونڈنے گئے تھے، شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ناکام واپس آ گئے۔ اس تلاش کی کہانی بہت دردناک ہے۔ سیلاب میں بہنے والے کی ماں اور بہنوں کا یہ حال تھا کہ بہتے سیلاب کے ساتھ دوڑتی تھیں۔ درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں کو بہتا دیکھتی تھیں اور چیخیں مار کر پانی میں اتر جاتی تھیں۔ مرد انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر پیچھے کرتے تھے۔ یہ سارے لوگ بہت آگے چلے گئے جہاں کس کا پاٹ چوڑا تھا۔ ایک جگہ ماں نے سیلاب میں چھلانگ لگا دی۔ وہاں پانی گہرا اور تیز تھا۔ تین آدمی اس کے پیچھے کود گئے۔ وہ کنارے سے دور نہیں تھی۔ مرد نے اسے پکڑ لیا لیکن وہ باہر نہیں آتی تھی۔ چیختی اور پکڑنے والوں کو گالیاں دیتی تھی۔ کہتی تھی کہ اپنے بچے کے ساتھ ڈوب مروں گی۔ اب مجھے سچا اگلے جہان میں ہی ملے گا۔

اسی طرح بہنیں بھی کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھیں۔

یہ لوگ اور آگے چلے گئے۔ ایک جگہ جہاں دونوں کس مل کر ایک ہو جاتے تھے۔ وہاں سے بہت دور آگے چوڑے پاٹ کے کنارے کتا ٹرد پڑا ملا لیکن مر چکا تھا۔ وہ کنارے کے درختوں کی جڑوں میں اٹکا ہوا تھا۔ ایک بہن مرے ہوئے کتے کے اوپر گر پڑی اور اس کے منہ کے ساتھ منہ رگڑ رگڑ کر ایسے دلدوز طریقے سے رونے لگی کہ مردوں کی بھی دھاڑیں نکل گئیں۔ کتے کے مالک کے ساتھیوں نے سب کو بتایا کہ کتا اپنے مالک کو بچانے کے لیے سیلاب میں کود گیا تھا۔ یہ سنا تو ماں اور بہنوں نے مرے ہوئے کتے کو باری باری اٹھا کر بچوں کی طرح پیار کیا اور چیخ کر رونے لگیں۔

سیلاب کا زور ختم ہو رہا تھا۔ تمام آدمی پانی میں اتر گئے اور پاؤں سے کس کی تہہ کو ٹٹولنے لگے۔ شام تک سیلاب بالکل اتر گیا۔ اندھیرا چھانے لگا۔ اب تلاش مشکل ہو گئی تھی۔ لوگوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو ماں اور بہنیں واپس نہیں آتی تھیں۔ انہیں گھسیٹ کر پانی سے نکالا گیا۔ ماں پانی میں بیٹھ گئی۔ اسے دو تین آدمی اٹھا کر گاؤں لائے۔ رات بھر گاؤں میں کوئی سو نہ سکا۔ عورتیں ڈوبنے والے کے گھر جمع رہیں۔ مرد بھی پڑوس کے صحن میں بیٹھے رہے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی کہ عورتوں کے بین عجیب سے شور میں بدل گئے۔ مرد باہر نکلے تو چند ایک عورتیں گلی میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہی تھیں۔ چاند بڑا شفاف تھا۔ ایک ہی آواز سنائی دیتی تھی کہ ادھر دیکھو۔ فلاں کے گھر دیکھو ــــ معلوم ہوا کہ ڈوبنے والے کی ماں لاپتہ ہو گئی ہے ــــ ہم سب پریشان ہو گئے ــــ ایک بزرگ نے کہا ــــ "میں جانتا ہوں کہاں گئی ہے۔ کس کی طرف بھاگو۔ وہ اور کہیں نہیں جا سکتی"۔

دن کو بارش برستی رہی تھی۔ ہر طرف کیچڑ تھا۔ بھاگنا دوڑنا بہت مشکل تھا۔ گاؤں کے نوجوان کس کی طرف دوڑ پڑے۔ کس کے قریب پہنچے تو انہیں ماں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ بہت بلند آواز سے اپنے بیٹے کو پکار رہی تھی۔ اگر اس کی آواز نہ سنائی دیتی تو کھڈ نالوں کے اس علاقے میں اسے تلاش کرنا بہت ہی مشکل تھا۔

اس کی آوازوں پر آدمی اس حد تک پہنچ گئے مگر وہ واپس آنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ تو پاگل ہو چکی تھی۔ نہایت اطمینان سے کہتی تھی کہ مجھے بیٹے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مجھے یہاں سے آواز دی کہ بے جی، جلدی آؤ، مجھے گھر لے چلو۔۔۔

ماں کی یہ حالت دیکھ کر مردوں کے دل بھی لرز گئے۔ اسے بڑی مشکل سے گھر لایا گیا۔ لیکن اس کی ذہنی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ کبھی تو یہ کہتی کہ میں اپنے بچے کے لیے روٹی یہیں لاؤں گی۔ اس کے لیے پراٹھے پکاؤں گی۔ اور کبھی کہتی کہ اس کے لیے نواری پلنگ لے آتی ہوں۔ وہ شاید آج کی رات یہیں سوئے گا۔ اور کبھی وہ ہنس ہنس کر اس کے بچپن کی باتیں سنانے لگتی۔ گاؤں کے آدمی اسے باتوں میں لگا کے گھر لے آئے لیکن اسے سنبھالنا بہت مشکل تھا۔

رات بڑی مشکل سے لوگوں نے کاٹی۔

دوسری صبح پھر تلاش شروع ہو گئی۔ گاؤں کے لوگ بہت دور تک چلے گئے مگر ٹرو کے مالک کا کوئی سراغ نہ ملا۔ کس میں سیلاب کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہلکا پھلکا پانی بڑی معصومیت سے بہ رہا تھا اور اس معصومیت میں نہ جانے کتنے حادثے چھپے ہوئے تھے۔ گاؤں میں ماتم ہو رہا تھا۔ ڈوبنے والے کی ماں اور دو بہنوں کی چیخیں اور بین عرش کے کنگروں کو ہلا رہے تھے۔ ماں کا یہ حال تھا کہ کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی چیخ چیخ کر رونے لگتی

اس گھرانے پر موت کے سائے تو ہر وقت منڈلاتے رہتے تھے۔ ہمارے اس نوجوان دوست کا ایک چچا، بڑا بھائی اور ایک ماموں قتل ہو چکے تھے۔ باپ لڑائی جھگڑے میں دو دفعہ زخمی ہوا اور ایک آدمی کے قتل میں سات سال سزائے قید بھگت چکا تھا۔ تایا پھانسی چڑھ گیا تھا اور یہ سلسلہ جو تیس چالیس سال پہلے شروع ہوا تھا ابھی تک چل رہا تھا۔ ان کی دشمنی پانچ کوس دور کے ایک گاؤں والوں سے تھی۔ اس دشمنی کی ابتدا ایک شادی سے ہوئی تھی۔ ایک سال کے اندر ہی چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ اصل جھگڑے کی وجہ کوئی ایسی سنگین نہیں تھی کہ چند آدمی قتل ہو جاتے اور کچھ پھانسی چڑھ جاتے مگر ہمارے علاقے میں ایک لفظ عام ہے اور وہ ہے "ناک" جسے ہم لوگ عزت اور وقار کی علامت سمجھتے ہیں۔ یہ محاورہ اکثر استعمال ہوتا ہے "فلاں آدمی بڑا اجاہر ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔"

لہٰذا ہمارے علاقے کے قتل اور خون خرابے "ناک" کی خاطر ہوتے ہیں۔ پہلے بھی ہوتے تھے، اب بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً لڑکی کو میکے سے لانے کے لیے سسرال والوں نے دولہا کے بھائی کو بھیج دیا تو لڑکی کے میکے والوں نے کہہ دیا کہ دولہا خود آئے یا اس کی ماں یا باپ آئے۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت اس لڑکی کو میکے سے نہیں لا سکتی۔ سسرال والے ڈٹ جاتے ہیں کہ ہم کسی اور کو نہیں بھیجیں گے اور میکے والے باقاعدہ مورچے باندھ لیں گے کہ ہم لڑکی کو اسی کے ساتھ بھیجیں گے جس کے ساتھ ہم بھیجنا چاہیں گے۔ پھر کوئی بھی دوسرے کی شرط تسلیم نہیں کرتا کیونکہ "ناک پر مکھی بیٹھ جاتی ہے" ۔۔۔ اس گھرانے میں بھی ایسی ہی کسی وجہ سے جھگڑا شروع ہوا تھا جو ابھی تک جاری تھا۔

دونوں گھرانوں کا کوئی آدمی اکیلا کہیں دور نہیں جاتا تھا کیونکہ دوسری پارٹی کے ہاتھوں مارے جانے کا خطرہ تھا۔ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ جس کے ہاتھوں کوئی قتل ہوا ہو وہ

پھانسی چڑھ جاتے۔ اکثر قاتل شک کی بنا پر بری ہو جاتے تھے یا سزائے موت مل بھی جاتے تو اپیل کورٹ میں اپیل کر کے بری ہو جاتے تھے مگر وہ باہر آ کر کھلے بندوں گھوم پھر نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ مقتول کے لواحقین کو خون کا بدلہ لینا ہوتا تھا۔ گزرے ہوئے تیس چالیس سالوں میں کئی ایک قتل ہوئے تھے لیکن پھانسی صرف دو کو ملی تھی۔ تین کو عمر قید اور چند ایک کو پانچ سات سال کی سزائے قید۔

اب ٹرد کے مالک کے دشمنوں کو انتقام لینا تھا کیونکہ ادھر سے دو آدمی ان کے ایک آدمی کے قتل کے مقدمے سے بری ہو آئے تھے۔ ٹرد کا مالک اس گھرانے کا واحد نوجوان تھا جسے ماں باپ اکیلے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ شکار کے لیے جایا کرتا تھا جس پر اس کے ماں باپ کو کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ ہمارے ساتھ اسے کوئی خطرہ نہ تھا مگر اب وہ سیلاب میں ڈوب گیا اور لاش بھی نہ ملی۔

ہسپتال میں ہمارے دوست "موٹر" کی حالت اسی رات بہتر ہو گئی تھی۔ ریچھ کے پنجے اس کے جسم میں گہرے اتر گئے تھے لیکن "موٹر" بڑی پکی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ہم آدھی رات تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ جونہی وہ ہوش میں آیا تو اس نے ہمیں دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی ——

"ادئے حرامیو، میری ماں کو نہ بتانا ورنہ وہ مجھے مویشیوں کے کمرے میں کھرلی پر باندھ دے گی۔"

یہ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کی ماں جو شام کے وقت ہی گاؤں کے کچھ آدمیوں کے ساتھ گوجر خان ہسپتال پہنچ گئی تھی، بول پڑی وہ "موٹر" کے پلنگ کے دوسری طرف کھڑی تھی۔ "موٹر" نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ ماں نے لپک کر بیٹے کا منہ

دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے گالوں اور ماتھے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر بیٹے سے زخموں کے متعلق پوچھا۔ "موٹر" نے اسے تسلی دی اور کہا کہ زخم بہت معمولی ہیں، یہ لڑکے معلوم نہیں مجھے یہاں کیوں اٹھا لائے ہیں۔ میں تو ابھی گاؤں جانے کو تیار ہوں۔

ماں نے جب یہ سنا تو اس نے پلنگ سے ذرا پرے ہٹ کر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے اور دانت پیس کر "موٹر" سے کہا —— "تیرا باپ بھی حرام کی نسل ہے اور تو اصل حرامی ہے۔ تو کہتا ہے میں تجھے کھرلی سے باندھوں گی؟ تو چل گھر۔ میں تجھے کتے کے ساتھ باندھوں گی اور اسی کے ساتھ تجھے روٹی دوں گی" —— "موٹر" کا باپ زندہ دل انسان تھا۔ پاس ہی کھڑا ہنس رہا تھا۔ اس نے کہا —— "خدا تجھے ہدایت دے۔ ذرا آہستہ بول۔ وارڈ میں مریض سوتے ہوئے ہیں" —— ماں نے غصے سے بیٹے کے جسم کو دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ ایسا غصہ تھا جس میں پیار ہی پیار تھا۔ اس عورت کے دل میں خاوند کا جو پیار تھا اس کی مثال دی جایا کرتی تھی۔ یہ پیار کی بے تکلفی تھی کہ وہ خاوند کو بھی جو منہ میں آتے کہہ گزرتی تھی۔

اپنے بیٹے سے فارغ ہو کر ماں ہماری طرف متوجہ ہوئی اور دل کھول کر ہمیں گالیاں دینے لگی۔ اس دوران اس نے ہم سب کو قمیض اٹھوا اٹھوا کر دیکھا کہ ہم میں سے کوئی اور تو زخمی نہیں۔ اسے جتنا پیار اپنے بیٹے سے تھا اتنا ہی ہم سب سے تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ہم سب ٹھیک ہیں تو اس نے ہمیں شکار سے باز آ جانے کو کہا۔ جب دیکھا کہ ہم پر کوئی اثر نہیں ہو رہا اور ہم ہنس رہے ہیں تو اس نے کہا —— "دیکھو لمنجنو۔ تم سمجھتے نہیں ہو۔ اگلے جہان خدا تمہیں کتے بنائے گا اور یہ کتے تمہارے ملوں میں زنجیریں ڈال کر تم سے گیدڑ اور خرگوش مروائیں گے۔ خدا کے عذاب

سے ڈرو۔"

ہسپتال میں پہلی رات گزر گئی۔ ہم صبح گاؤں کو روانہ ہوئے۔ "موٹر" کو ابھی کچھ دن اور ہسپتال میں رہنا تھا۔

ہم گاؤں پہنچے تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہم سب کی ماؤں بہنوں نے ہمارا کیا حشر کیا ہوگا۔ صرف بزرگ تھے جنہوں نے کچھ نہ کہا۔ یہ تو میں آپ کو پہلی کہانی میں بتا چکا ہوں کہ ہمارے باپ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ ہم عورتوں کی طرح گھروں یا گاؤں میں بیٹھے رہیں ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہم مرد بنیں اور سختیاں سہنے کے قابل ہو جائیں۔

یہ اس حادثے کا دوسرا دن تھا۔ گاؤں کے بہت سے آدمی ہمارے دوست کی لاش کی تلاش میں نکل گئے تھے ـــــ میں نے ڈوبنے والے کا نام ابھی تک نہیں بتایا۔ اس کا نام جلال خان تھا اور ہم اسے جلّو کہا کرتے تھے۔ ایک بزرگ نے ہم سب شکاری لڑکوں سے کہا۔ "تمہارے کتے زمین کے نیچے سے شکار نکال لاتے ہیں۔ کتے لے جاؤ اور اپنے دوست کی لاش کو ڈھونڈو۔ شاید لہو پا کر کتے ڈھونڈ لیں۔ اس وقت تک بھیڑیئے اور گیدڑ لاش کو کھا چکے ہوں گے۔ اس کے جسم کا کوئی ایک آدھ حصہ ہی ڈھونڈ لاؤ۔ شاید دو چار ہڈیاں ہی مل جائیں جو دفن کر کے قبر تو بنا دیں۔ جلّو تمہارا دوست تھا۔ اس کی کوئی یادگار، کوئی نشانی تو سامنے ہونی چاہیئے۔"

ہم اُسی وقت کتے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے اور اُس جگہ تک پہنچے جہاں ہمارے دوستوں نے جلّو کو آخری بار سیلاب میں بہتے دیکھا تھا۔ پانی کی ایک لکیر سی بہہ رہی تھی۔ ہم نے کتوں کو کھلا چھوڑ دیا اور کس کے اندر اندر آگے چلے گئے جہاں دو کس مل کر گھومتے تھے وہاں جھیل سی بنی ہوئی تھی اور پانی بہت گہرا تھا۔ ہم سب نے

کپڑے اُتارے اور غوطے لگانے لگے۔ ہم تہ تک گئے اور ٹٹول ٹٹول کر لاش تلاش کی مگر لاش کا کوئی سراغ نہ ملا۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کس کے راستے میں سیلوں کی بھربھری سی چٹانیں بھی آجاتی ہیں جو پانی کا رُخ موڑ دیتی ہیں۔ سیلاب ان چٹانوں کو کاٹتا رہتا اور گھومتا رہتا ہے جس سے پانی کے اندر چٹانوں میں غاریں بن جاتی ہیں۔ کوئی آدمی پانی کا دھکیلا ہوا ایسی کسی آبدوز غار میں چلا جائے تو نکل نہیں سکتا بلکہ اس کی لاش بھی باہر نہیں آتی۔ ہمارے کس کے راستے میں ایسی چٹان تھی لیکن اس کے قریب پانی کے نیچے جانے کی کسی نے جرأت نہ کی۔ ایسی جگہوں پر پانی جھیل کی طرح جمع ہو جاتا تھا جسے ہم اپنی زبان میں "ڈھنڈ" کہا کرتے تھے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جلّو آبدوز غار میں گم ہو گیا ہے اور تلاش بے سود ہے۔ پھر بھی ہم اور آگے چلے گئے۔ آگے پھر پانی بہت ہی تھوڑا تھا۔

سیلاب جہاں جہاں تک پھیلا تھا وہاں کی کوئی جھاڑی اور درخت ہم نے نہیں چھوڑا۔ جہاں کچی مٹی کا ڈھیر نظر آیا اسے کھود کر دیکھا۔ جلّو کی لاش نہ ملی۔ ہم پانچ میل دُور تک چلے گئے۔ اور شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو ناکام واپس آگئے۔ گاؤں میں جس سب سے بڑی مشکل کا سامنا تھا وہ جلّو کی ماں تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح باتیں اور حرکتیں کرتی تھی۔ ہم سب دوستوں نے اسے سنبھالنے کی کوشش شروع کر دی لیکن یہ کام ناممکن تھا۔

تیسرے دن جلّو کے باپ نے دل پر پتھر رکھ کر کہا کہ غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھو اور قُل بھی کر دو۔ اب تو ہر کسی کو یقین ہو گیا تھا کہ جلّو ڈوب کر مر گیا ہے لیکن کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کہ نمازِ جنازہ پڑھو۔ یہ جلّو کے باپ نے خود ہی کہہ دیا۔ گاؤں کے باہر جنازہ پڑھا گیا۔ میں وہ منظر الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ سامنے کوئی میّت نہیں تھی۔ نمازِ جنازہ

پڑھتے ہوئے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارا نوجوان دوست مر گیا ہے۔ جنازہ پڑھتے وقت صفوں سے ہچکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

نمازِ جنازہ پڑھی جا چکی تھی۔ ہم صفوں میں بیٹھے ہوئے فاتحہ پڑھ رہے تھے کہ جلّو کی ماں سر سے دوپٹہ اُتارے دوڑتی آئی اور امام کے پاس کھڑے ہو کر چلّانے لگی "تم کس کا جنازہ پڑھ رہے ہو؟... تم میرے بیٹے کا جنازہ پڑھ رہے ہو۔ وہ زندہ ہے۔ وہ آ رہا ہے۔ وہ مرا نہیں۔ مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے، لیجیے میں آ رہا ہوں۔ مت جنازہ پڑھو۔ کہاں ہے میرے بچّے کی میت؟ قبر کہاں کھودی ہے؟"

ہمارے دل دہل گئے۔ میں نے آسمان کی طرف منہ کر کے دل میں خدا سے کہا "یا میرے مولا! اس ماں کو اس کا بچّہ واپس کر دے یا اسے صبر عطا کر۔"

ہم پھر لاش کی تلاش میں نکل گئے اور رات کو مایوس واپس آ گئے۔ اگلے دن جو جلّو کی موت کا پانچواں دن تھا، ہم گاؤں میں ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے چند اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ ہر کوئی غمگین اور پریشان تھا۔ اگر کوئی بولتا تھا تو یہی کہتا تھا — "لاش تو ملنی چاہیے۔ لاش کہاں گئی؟"

میں نے سوچا کہ چلو آج ایک بار پھر تلاش کر لیتے ہیں۔ میں اٹھا اور وہیں سے اپنے شکاری دوستوں کو آوازیں دینے لگا۔ پھر میں ذرا آگے چلا گیا۔ میں اکرم کو آواز دینے کے لیے چیخنے ہی لگا تھا "اوے اکو" — لیکن آواز حلق میں ہی رُک گئی اور مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا — ایک گھوڑا تھا جس کے آگے ایک بوڑھا آدمی تھا۔ باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں اور ہمارا دوست جلّو جس کی ہم نے نمازِ جنازہ پڑھ کر قُل کی رسم بھی ادا کر دی تھی، گھوڑے پر بیٹھا تھا — اس

کا رنگ زرد تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ حیرت زدہ تو میں اس لیے ہوا کہ جس بوڑھے نے گھوڑے کی باگیں تھام رکھی تھیں، وہ ان کے دشمنوں کا ایک بزرگ تھا اور تیس سال کے عرصے میں اس پارٹی کا یہ پہلا آدمی تھا جو اس گاؤں کے اندر آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس گاؤں کے اندر جا کر اس کی لاش ہی باہر نکلے گی۔

میں آگے بڑھ کر اپنے دوست کا استقبال کرنے کی بجائے اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس دوران گاؤں کے کچھ بچّے اور چند ایک عورتیں بھی پہنچ گئیں۔ شور بپا ہو گیا۔

"جلّو آ گیا، جلّو آ گیا۔"

درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ گھوڑے کی طرف اُٹھ دوڑے۔ جلّو کی ماں اور بہنوں نے جس طرح اسے سینوں سے لگایا اور بازوؤں میں جکڑ کر گھر لے گئیں، وہ بہت ہی جذباتی منظر تھا۔ اِدھر منظر یہ تھا کہ جلّو کے باپ اور دوسرے رشتہ داروں نے اور ہم سب نے گھوڑے اور بوڑھے کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ بوڑھا سب کو دیکھ رہا تھا اور سب خاموش تھے۔ دشمنوں کا بزرگ مرغے میں آ گیا تھا۔ آخر بوڑھا جلّو کے باپ کو دیکھ کر بولا — "تمہارا بیٹا پانچ دنوں سے ہمارے گھر میں پڑا تھا۔ ہمارے ایک آدمی نے اسے سیلاب سے نکالا تھا۔ تمہارا بیٹا بے ہوش تھا۔ ہمارا آدمی اسے کندھے پر اُٹھا لایا۔ ہم نے تمہیں اس لیے اطلاع نہ دی کہ اطلاع ملتے ہی تم ہمارے پیچھے پڑ جاتے کہ ہمارا لڑکا واپس کرو۔ تم ہم پر شک کرتے کہ ہم تمہارے لڑکے کو قتل کر دیں گے۔ ہم دراصل لڑکے کو بالکل تندرست کر کے تمہارے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ یہ ہمارا دشمن نہیں ہمارا مہمان تھا۔ میں اور میرے بیٹے تمہیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم مرد ہیں ہیجڑے نہیں۔ بدلہ لیں گے تو آمنے سامنے آ کر لیں گے اور تمہارے اس آدمی کو قتل کریں گے جو بے ہوش

نہیں ہوگا بلکہ جو اپنے آپ کو رستم سمجھے گا.... اپنا لڑکا سنبھالو — اسلام علیکم"۔

بوڑھے نے گھوڑے کے رکاب میں پاؤں رکھا اور جب زور لگا کر چڑھنے لگا تو جلّو کے باپ نے دوڑ کر اسے کمر سے پکڑ لیا اور اسے گھما کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بوڑھے نے ہنس کر کہا — "یار، مرد ہو، عورتوں کی طرح روتے کیوں ہو"؟ — جلّو کے باپ نے اسے چھوڑ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا — "اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔ میرے گھر چلو"۔ — جلّو کے ایک چچا اور دوسرے چند آدمیوں نے بھی اصرار کیا کہ بوڑھا جو دوستوں کی طرح آیا ہے، دشمنوں کی طرح واپس نہ جائے۔ بوڑھے نے بڑی دلیری سے کہا "دشمنوں کے گھر کے پانی کا ایک گھونٹ بھی حرام ہے" — لیکن یہ "حرام" اسے قبول کرنا ہی پڑا۔ جلّو کے بزرگ اور گاؤں کے لوگ اسے گھسیٹ کر گھر لے گئے اور خاطر تواضع کی۔

ایک نوجوان جو اپنے ماں باپ کے لیے مر چکا تھا، ان کے پاس جیتا جاگتا آ گیا۔ یہ کوئی معمولی سی بات نہیں تھی۔ اپنے بیٹے کے متعلق ماں باپ اور بہن بھائیوں کے جو جذبات ہوتے ہیں، ان سے کون آگاہ نہیں۔ اپنے بچّے کی خاطر ماں باپ اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ تو صرف دشمنی تھی۔ وہ انہوں نے دل سے نکال دی۔ بوڑھے کو رخصت کر کے انہوں نے گاؤں اور برادری کے بڑوں سے بات کی کہ وہ اتنی بڑی نیکی کے جواب میں دشمنی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ دشمنوں کا کیا جاتا کہ وہ ان کے لڑکے کو بے ہوش پڑا رہنے دیتے یا سیلاب میں پھینک دیتے، ان کا انتقام بھی پورا ہو جاتا اور وہ قتل کے جرم میں پکڑے بھی نہ جاتے لیکن ان لوگوں میں آخر کردار والی رمق موجود تھی اسی لیے انہوں نے لڑکا نہ صرف واپس کر دیا بلکہ تندرست کر کے واپس کیا۔

دوسرے دن دیہات کی روایت کو توڑا گیا اور جلّو کا باپ، چچا اور برادری کے چار بزرگ دشمنوں کے گاؤں میں گئے اور امن کا زبانی معاہدہ کر آئے۔ معاہدے کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ ایک فریق نے یعنی جلّو کے بزرگوں نے سر جھکا لیا تھا اور ناک پر مکھی کو بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ رشتے ناطے جو ایک مدت سے ٹوٹ گئے تھے پھر سے جوڑے گئے۔ جلّو کی ایک بہن کا رشتہ اس برادری میں دیا گیا اور اس برادری کی ایک لڑکی کا رشتہ جلّو کو دیا گیا۔

ہمیں رشتوں ناطوں سے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم جلّو سے یہ سننے کو بے تاب تھے کہ سیلاب کے اندر اس پر کیا بیتی۔ اس نے بتایا کہ سیلاب کا زور اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ کنارے کی طرف جانے کی جتنی کوشش کرتا تھا، سیلاب اُسے اتنا ہی نیچے کو دباتا تھا۔ اس نے اپنے کُتے ٹرو کو اوپر سے چھلانگ لگاتے دیکھ لیا تھا۔ پھر وہ کُتے کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ کُتے کے متعلق اس نے بتایا کہ کچھ تو کُتے نے اس تک پہنچنے کی کوشش کی اور کچھ جلّو نے اس تک پہنچنے کے لیے زور لگایا۔ اس نے کُتے کو پکڑ کر کندھے پر بٹھا لیا لیکن کُتا پانی میں اُتر گیا۔ اور اس نے جلّو کو اپنی اس حرکت سے حیران کر دیا کہ وہ جلّو کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جلّو نے بتایا کہ وہ شاید کسی جگہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن ٹرو کو ساتھ لے کے اس قدر تیز اور گہرے سیلاب میں تیرنا بہت ہی مشکل تھا۔ پھر وہ درختوں کے ملنے کے مقام پر جا پہنچا۔ ٹرو اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ایسے محسوس کیا جیسے کوئی بہت ہی طاقت ور جانور اسے پکڑ کر نیچے کو لے جا رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک جگہ گھومنے لگا۔ پھر یہ دائرہ تنگ ہونے لگا اور پھر وہ لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ اس نے

اُوپر دیکھا تو آسمان پر چھائے ہوئے بادل بہت تیزی سے ایک چکر میں گھوم رہے تھے۔ جلّو اس قدر بے بس ہو گیا کہ اسے اپنے کُتّے کا کوئی ہوش نہ رہا اور اس کے بعد اسے اس دنیا کی جس آخری بات کا احساس رہا وہ یہ تھا کہ پانی کے کسی بڑے ہی خوفناک اور طاقتور درندے نے اسے پکڑ رکھا ہے جو اسے گھما گھما کر نیچے لے جا رہا ہے ــــ وہ دراصل دو سیلابی کسّوں کے ملاپ میں پھنس گیا تھا جہاں سیلاب کا نوّے درجے کا موڑ تھا۔ سامنے سلوں کا ٹیلا تھا جس سے ٹکرا کر سیلاب مڑتا اور بڑے ہی خوفناک بھنور پیدا کرتا تھا۔

جلّو کی آنکھ کھلی۔ وہ ہوش میں آیا تو وہ ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں کہ سیلابی بھنور نے اسے کب اور کس طرح اُگل دیا تھا اور وہ زندہ کس طرح رہا اور وہ کہاں جا اٹکا اور اسے کون اُٹھا لایا۔ اس نے چارپائی پر لیٹے لیٹے جب ان تین آدمیوں کو دیکھا جو اس کے قریب کھڑے تھے تو اس پر پھر غشی طاری ہونے لگی کیوں کہ وہ اس کے دشمن تھے۔ کوئی وجہ ہی نہیں تھی کہ وہ اسے زندہ چھوڑ دیتے۔ انہی کے ڈر سے وہ اکیلا گاؤں سے دُور نہیں جایا کرتا تھا لیکن اس بوڑھے نے جو اُسے گھوڑے پر گاؤں لایا تھا۔ یقین دلایا کہ وہ ان کا مہمان ہے اور دشمنی اس وقت شروع ہو گی جب وہ تندرست ہو کر اپنے گاؤں پہنچ جائے گا۔

اسے دودھ اور گھی پلایا جاتا رہا۔ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی نہ کوئی زخم تھا۔ البتہ جسم کا جوڑ جوڑ جیسے کھل گیا تھا اور ہڈی ہڈی درد کرتی تھی۔ کمزوری اتنی زیادہ تھی کہ وہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے دشمن میزبانوں سے کہا کہ اس کے گھر والوں کو بلا لیں لیکن اسے یہی ایک جواب ملتا رہا کہ جب ٹھیک ہو جاتے گا تو اسے گاؤں پہنچا دیں گے۔ وہ ڈرتا رہا کہ یہ دھوکا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی آدمی کوئی فالتو بات نہیں

کرتا تھا۔ دشمنی بدستور قائم تھی۔ اور میزبانی اور علاج پورے خلوص سے ہو رہا تھا۔ آخر وہ اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ جب اُسے بتایا گیا کہ ٹرو مر گیا ہے تو وہ بہت رویا اور وہ بہت عرصہ مغموم رہا۔

جلّو کی ماں جو پہلے غم سے پاگل ہو گئی تھی اب خوشی سے پاگل ہونے لگی۔ بہرحال جلد ہی سنبھل گئی۔ سات آٹھ روز بعد مورٹھی ہسپتال سے آ گیا۔ گاؤں میں یہ حال ہو گیا کہ ہم سب کی مائیں ایک طرف اور باپ دادے ایک طرف ہو گئے۔ دو محاذ بن گئے۔ باپ دادے ہمیں شکار سے روکنا نہیں چاہتے تھے اور مائیں دھمکیاں دے رہی تھیں کہ وہ کُتّوں کو زہر کھلا دیں گی۔ ہم ڈرنے لگے کہ مائیں نہیں کہیں کُتّوں کو زہر دے ہی نہ دیں۔ لہٰذا جہاں کُتّے ہماری رکھوالی کیا کرتے تھے، ہم رات کے وقت کُتّوں کی رکھوالی کرنے لگے۔ ایک مہینے تک ہمارا شکار بند رہا۔ آخر ہم ایک روز باپوں اور دادوں کی حوصلہ افزائی سے شکار کو چلے گئے۔

یہ کہانی پڑھ کر آپ یہ نہ سمجھیں کہ جلّو کی جان بچا کر دشمنی ختم ہو گئی تھی۔ جلّو کی بہن کی شادی اُس گاؤں میں اور اس گاؤں کی لڑکی کی شادی جلّو سے کر دی گئی تھی لیکن اس معاہدے کا وہی حشر ہُوا جو پاکستان اور بھارت کے معاہدوں کا ہوتا ہے۔ نئے رشتوں سے نئے جھگڑے پیدا ہوتے اور ان سے پُرانی عداوت پہلے سے شدید ہو کر سامنے آ گئی ہے اور ڈانگ سوٹے کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔

خدا کی قسم مَیں کنواری ہُوں

لڑکی کے گال پر چھوٹے شاہ جی کے دانتوں کا نشان
تھا۔ وہ قسمیں کھا رہی تھی کہ مَیں کنواری ہُوں۔ چھوٹے
شاہ جی کو ترس نہ آیا۔ معصوم لڑکی کی فریاد آسمان
سے بجلی بن کر ٹُوٹی۔

جب

ہم لڑکپن میں پوٹھوار جیسے دشوار گزار دیہاتی علاقے میں کتوں کا شکار کھیلا کرتے تھے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بڑھاپے میں یہ کہانیاں کسی رسالے کے لیے لکھنی بھی پڑیں گی۔ اگر پتہ ہوتا تو ڈائری لکھتا رہتا۔ لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ڈائری کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ نے "حکایت" جنوری ۱۹۷۱ کے شمارے میں میری کہانی "جبکی بیچاری کا کیا قصور" شائع کی تھی۔ میں نے اپنی ہی لکھی ہوئی کہانی پڑھی تو اُس دور کا ایک ایک منٹ یاد آ گیا۔ جب ہم کتوں کے ساتھ کتوں کی رفتار سے پاپیادہ کھڈ نالے اور اونچی نیچی ٹیکریاں پھلانگتے گیدڑوں، خرگوشوں اور بھیڑیوں کے پیچھے بھاگا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اُس دور کو یاد کرتا ہوں تو کئی واقعات فلم کی طرح ذہن کے پردے پر تھرکنے لگتے ہیں۔ ایسی فلم دیکھ کر مجھے آج کل کی فلمیں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

میری کہانی "جبکی بیچاری کا کیا قصور" پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ اپنے عزیز دوست افضل کے کتے "موتی" کی تلاش میں، میں پانی مار کی غار میں گھس گیا تھا اور غار کی بھول بھلیوں میں دُور اندر جا کر بھیڑیوں سے مقابلہ ہو گیا تھا۔ ایک بھیڑیئے کو میں نے چاقو سے مار ڈالا تھا اور دوسرے کو بوہلی نے ختم کر دیا تھا۔ بھیڑیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ایک بھیڑیئے نے میرے ٹخنے میں دانت گاڑ دیے تھے۔ زخم گہرے تھے۔ افضل کو اس کے اپنے ہی بوہلی نے ٹانگ پر کاٹ کھایا تھا۔ اس کا زخم بھی گہرا تھا۔

دونوں کے زخم ملتے مہینہ لگ گیا۔ ہم کسی ڈاکٹر سے مرہم پٹی تو کیا یا نہیں کرتے تھے۔ کورے سُوت کی اٹی کو جلا کر اس کی راکھ یا پسی ہوئی ہلدی گھی میں تل کر زخم پر باندھ دیا کرتے تھے۔ ہم ٹوٹی ہوئی ہڈیاں بھی خود ہی جوڑ لیا کرتے تھے۔

زخم ملنے تک ہم اگلے شکار کا پروگرام بناتے رہے اور ماں جی مرحومہ اُٹھتے بیٹھتے دھمکی دیتی رہیں کہ اب تو کتے کو لے کر باہر نکلا تو ٹانگیں توڑ دوں گی اور کتے کو کچلا کھلا دوں گی۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ کچلا ایک زہر ہوتا ہے جو کتوں کو مارنے کے لیے کھلایا جاتا ہے۔ اگر میں ماں جی کو یہ بتا دیتا کہ مجھے بھیڑیئے نے کاٹا ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتیں۔ ہم نے گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ کتے نے کاٹا ہے ورنہ سب کی مائیں مل کر ہمارا شکار بند کر دیتیں۔ ہمارے علاقے کا سب سے زیادہ خطرناک درندہ بھیڑیا ہوا کرتا تھا جسے ہم اپنی زبان میں بھگیاڑ کہا کرتے ہیں۔ اب علاقے میں جنگل کم اور آبادیاں زیادہ ہو گئی ہیں اس لیے بھیڑیئے بھی کم ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھار رات کو بہت دُور سے بھیڑیئے کی آواز سُنائی دیتی ہے تو لڑکپن اور جوانی کا وقت یاد آ جاتا ہے۔ کبھی تو بھیڑیئے کی آواز اس طرح لگتی ہے جیسے کوئی بھیڑیا للکار رہا ہو کہ آؤ، اب میرا

شکار کر کے دیکھو مگر اب میں شکار کے قابل نہیں رہا۔ بڑھاپا بھیڑیوں کا چیلنج قبول نہیں کرنے دیتا۔

وقت وقت کی بات ہے۔ ہمارا وقت کچھ اور تھا، یہ وقت کچھ اور ہے۔ زمانہ تو بدلا سو بدلا، انسان بھی بدل گئے ہیں اور نوادر موسم بھی بدل گئے ہیں مگر افسوس اس بات پر آتا ہے کہ ایک چیز جسے بہت مدت پہلے بدل جانا چاہیئے تھا وہ جُوں کی توں ہمارے ہاں موجود ہے۔ وہ ہے پیر —— پیر پرستی دیسی کی دیسی ہے جیسی ہمارے وقتوں میں ہُوا کرتی تھی۔ ہم بھی پیروں کی پوجا کرتے تھے جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارے بزرگ اُن کے پجاری تھے۔ ہمارے گاؤں سے دو کوس دُور ایک پیر کی گدّی تھی۔ اب بھی ہے۔ میں اس گدّی کا مرید تھا۔ والد صاحب مرحوم جب مجھے ان کا مرید بنانے کے لیے لے گئے تھے تو برادری کا ایک جلوس ساتھ گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں سبز جھنڈا دیا گیا تھا جس پر سفید کپڑے کا بنا ہُوا حضرت علیؓ کا دستِ مبارک سِلا ہُوا تھا۔ دو ڈھول بھی ساتھ تھے۔

پیر صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے تو میرے والد صاحب نے نقد نذرانہ پیر صاحب کے پاؤں میں رکھ کر دو زانو اور دست بستہ عرض کی تھی کہ ناچیز کے حقیر بیٹے کو مریدی کا شرف بخشا جائے۔ جب پیر صاحب نے شراب کے نشے سے چڑھی ہوئی آنکھوں کو ذرا کھول کر مجھے مریدی کا شرف بخشا تھا تو والد صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور میری پیشانی پیر کے پاؤں پر رکھ دی تھی۔ مجھ پر پیر کا جلال ایسا سوار ہُوا کہ میں نے اس کے پاؤں چوم لیے تھے۔ فضا ہی کچھ ایسی تھی۔ اس کے بعد ہم جب بھی شکار کا ارادہ کرتے تھے تو ایک روز پہلے پیر صاحب

سے کامیابی اور سلامتی کی دعا کرایا کرتے تھے اور کبھی کبھی دو تین روپیوں پر پیر صاحب سے پھونک مروا کر تمام کتوں کو کھلایا کرتے تھے۔ پیر صاحب کے خصوصی مرید ہمیں کہا کرتے تھے کہ پیر صاحب کی دم کی ہوئی روٹی کھا کر کتے شیر کو بھی مار لیا کرتے ہیں لیکن ہمارے علاقے میں شیر نہیں تھے جو ہم پیر صاحب کی اس کرامات کو آزماتے۔

ہمارے پیر صاحب کی کرامات کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان کے متعلق کئی روایات مشہور تھیں۔ ایک یہ کہ اگر سانپ یا ناگ یا اژدہا راستہ روک لے تو پیر صاحب کا نام لینے سے سانپ، ناگ، اژدہا، شیر، چیتا یا جو کوئی درندہ یا بلا ہو راستہ دے دیتی ہے۔ میرے والد صاحب نے مجھے سُنایا تھا کہ ایک بار ایک آدمی رات کے وقت کہیں جا رہا تھا کہ ایک ناگ نے پھن مار کر اُس کا راستہ روک لیا۔ وہ آدمی ہمارے پیر صاحب کا مرید تھا۔ اُس نے پیر صاحب کا نام لیا تو ناگ نے پھن لپیٹ لیا اور اس طرح بے حس ہو گیا جیسے مر گیا ہو۔ وہ آدمی ناگ کے اُوپر سے گزر آیا۔ اسے پیچھے سے آواز سُنائی دی "یہاں سے کبھی کوئی زندہ نہیں گزرا۔ تم نے ایسے پیر کا نام لیا ہے جس سے ہمارا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔"

وہ آدمی کون تھا؟ —— کسی کو معلوم نہیں۔ کوئی بھی یہ کہنے والا نہیں کہ اس آدمی نے مجھے یہ کہانی سنائی تھی۔ پھر بھی لوگ اس کہانی کو سچ اور برحق تسلیم کرتے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں بھی پیر صاحب کی اس کرامات پر ایمان لے آیا تھا۔ اس کے علاوہ پیر صاحب کی کرامات یہ تھیں کہ آندھی اور بگولوں کو روک لیتے تھے۔ بے وقت بارش آ جائے تو روک لیتے تھے۔ کوئی مسافر راستے سے بھٹک جائے

تو پیر صاحب کا نام لینے سے اُسے صحیح راستے کا علم ہو جاتا تھا۔ کسی کی گائے، بھینس، بیل یا بکری گم ہو جاتے تو پیر صاحب کو نظر آجاتا تھا کہ گمشدہ مویشی کہاں ہے۔

ہم ان کرامات پر ایمان رکھتے تھے حالانکہ ہمارے مویشی گم ہوتے رہتے تھے مسافر راستوں سے بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ جایا کرتے تھے۔ متی جون میں آندھیاں اور بگولے چلتے تھے تو ہمارے بھوسے کے ڈھیروں کو جو سارے سال کی کمائی ہوتی تھی، اُڑا لے جاتے تھے۔ بے وقت بارشیں بھی ہوتی تھیں جو ہمارے کھیت کھلیان کا ستیاناس کر جاتی تھیں۔ پھر بھی ہم پیر صاحب کی کرامات پر یقین رکھتے تھے۔

پیر صاحب کا ایک بیٹا تھا۔ عمر تیس سال ہوگی۔ شادی شدہ تھا اور باپ کے بعد گدی کا حقدار — — سُنا تھا کہ پیر صاحب نے ساری کرامات اسے عطا کر دی ہیں اور اب وہ آندھی اور بارش کو روک سکتا ہے اور بھولے بھٹکے مسافر اس کا نام لے کر راستہ معلوم کر سکتے ہیں۔ دیہات میں اس کی عزت اس کے باپ جتنی تھی۔ جس گاؤں سے گزرتا تھا راہ چلتے لوگ رُک کر سر جھکا دیتے تھے اور عورتیں سروں پر دوپٹے اوڑھ کر اپنی انگلیوں کو چومتی اور آنکھوں سے لگاتی تھیں۔

پیر صاحب کے اس بیٹے کو ہم چھوٹے شاہ جی کہا کرتے تھے۔ مریدوں کے خالص دودھ، مکھن، گھی، انڈوں اور مرغیوں کے پلے ہوئے یہ چھوٹے شاہ جی غیر معمولی طور پر تنومند تھے۔ گہرے گلابی رنگ کی وجہ سے خوبرو بھی تھے۔ نقش بھی اچھے تھے۔ ان کی اصلی کشش تو یہ تھی کہ وہ پیر صاحب کے فرزند تھے۔ اس فرزند نے جب پر کھولے تو معلوم ہُوا کہ خدا نے انہیں ایک اور کرامات بھی عطا کر دی ہے۔ وہ تھی بے اولاد عورت کو اولاد دینا۔ مگر وہ تعویذ خاوند کو نہیں بیوی کو دیا کرتے تھے اور یہ بھی پتہ

چلا تھا کہ وہ رات کو چلّہ کرتے تھے تو سائل عورت کو بھی ساتھ رکھتے تھے تاکہ چلّے کا اثر اس کی رگوں میں اُتر جائے۔

ہم نے ان کا یہ کرشمہ دیکھا تھا۔ ہمارے گاؤں کے قریب ہی ایک عورت نو دس سال سے بے اولاد تھی۔ وہ چھوٹے شاہ جی کے پاس جانے لگی تو اسے خدا نے بچہ عطا کیا تھا جس کا ہر ایک نقش چھوٹے شاہ جی سے ملتا جلتا تھا۔ پھر یہ عورت شاہ جی کے دروازے پر ہی (بلد دروازے کے اندر) بیٹھی رہتی تھی۔ اس کے بعد چھوٹے شاہ جی عورتوں میں مقبول ہو گئے اور عورتیں جب ان کی کرامات بیان کرتی تھیں تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چھوٹے شاہ جی کوئی فرشتے ہیں، جو عورتوں کو اولاد دینے کے لیے آسمان سے اُترے ہیں۔

پھر بھی گاؤں میں چند عورتیں ایسی غیرت والی تھیں جو چھوٹے شاہ جی کے پاس ایک ہی بار گئیں اور کانوں کو ہاتھ لگاتی واپس آگئی تھیں۔ وہ بڑے پیر صاحب کو تو مانتی تھیں، چھوٹے شاہ جی سے گھبراتی تھیں۔ اس تنومند انسان کی حالت اب یہ تھی کہ باہر نکلتا تھا تو بدمست سانڈ کی طرح چلتا تھا۔ کوئی نوجوان لڑکی نظر آجائے تو اس کی آنکھیں چڑھ جاتی تھیں۔

وہ بھی ہماری طرح شکار کا رسیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ ہمارے پاس کُتے تھے اور اس کے پاس ایک باز اور ایک شکرا تھا۔ شکار کے معاملے میں ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ باز اور شکرے کا شکار دلچسپ ضرور ہوتا ہے لیکن اس میں کُتوں کے شکار کی طرح بھاگ دوڑ نہیں ہوتی۔ باز کو کسی درخت پر بیٹھی ہوئی فاختہ دکھا کر چھوڑ دو تو باز جا کر اسے دبوچ لیتا ہے۔ کبوتر اور فاختہ کی عادت یہ ہے کہ باز کو دیکھ کر

کو اپنے اوپر جھپٹتا دیکھ لیں تو آنکھیں موند لیتے ہیں اور بے رحم پنجوں میں دبوچے جاتے ہیں۔ وہ اُڑتے اس صورت میں ہیں جب باز یا شکرا دُور ہوں۔ باز کا شکار اس وقت دلچسپ اور مشقت طلب ہوتا ہے جب اسے بھاگتے خرگوش پر چھوڑا جاتے۔

ایک بار اُس نے ہمارے ساتھ شکار پر جانے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن ہمارے ساتھ گیا کبھی نہیں تھا۔ پھر ایک ایسی واردات ہوگئی کہ چھوٹے شاہ جی کے متعلق ہمارا ایمان متزلزل ہوگیا تھا۔ مَیں اپنے ایک دوست کے ساتھ کسی دوسرے گاؤں سے واپس آرہا تھا۔ ہمارے علاقے کے خدوخال کچھ عجیب سے ہیں۔ کھڈ نالے بہت ہیں اور اونچے نیچے مٹی کے ٹیلے ہیں۔ انہی میں سے راستے گزرتے ہیں۔ ہم دونوں گاؤں کو آرہے تھے کہ ایک ٹیلے کے پیچھے سے کسی عورت کی اس طرح کی آواز آئی جیسے اُسے کوئی زبردستی چھیڑ رہا ہو۔ ہم رُک گئے۔ عورت کی گھبرائی ہوئی آواز پھر سُنائی دی ــــ "خدا کی قسم شاہ جی میری شادی نہیں ہوئی۔ مَیں کنواری ہوں۔ شادی شدہ ہوتی تو اور بات تھی" ــــ پھر اس کی آواز گھٹنے لگی۔ ہم دونوں دَوڑ کر ٹیلے کے پیچھے گئے۔ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے وہ بڑی اچھی نشیبی جگہ تھی۔

ہم نے دیکھا کہ چھوٹے شاہ جی کسی دوسرے گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑے ہوئے اُسے زمین پر لٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر شاہ جی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہ ہوتا کہ اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے مگر وہ شاہ جی تھے جن کی کرامات کے ہم قائل تھے۔ ہمیں دیکھ کر شاہ جی جھینپ گیا اور لڑکی کو چھوڑ کر اپنے اُوپر جلالی کیفیت طاری کر کے بولا ــــ "بدبخت لڑکی۔ یہ ڈر رہی ہے کہ مَیں اس کے ساتھ بدکاری کرنے لگا ہوں۔ مَیں

اِدھر سے گزر رہا تھا کہ مجھے دو چڑیلیں نظر آئیں۔ ایک کہہ رہی تھی کہ اسے لے چلو۔ میرے قریب تو وہ آنہیں سکتی تھیں۔ مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ وہ کسے اُٹھا لے جانا چاہتی ہیں۔ مجھے یہ لڑکی نظر آگئی۔ مَیں نے دَوڑ کر اسے پکڑ لیا اور دونوں چڑیلیں آگے نکل گئیں۔ اگر مَیں اسے پکڑ کر گرا نہ لیتا تو چڑیلیں اس کی گردن اُتار کر لے جاتیں۔"

سیدھی سادی دیہاتی لڑکی نے شاہ جی کی بات سُنی تو خوف کے مارے اس کی آنکھیں کُھل گئیں اور وہ اِدھر اُدھر اس طرح دیکھنے لگی جیسے ہر طرف چڑیلیں نظر آرہی ہوں۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ شاہ جی نے ہمیں حکم دیا کہ اسے گھر چھوڑ آؤ، بدبخت ڈر تی ہے ــــ شاہ جی کا گھوڑا ذرا پرے کھڑا تھا۔ وہ پھنکارتا ہُوا گھوڑے کی طرف چل پڑا اور ہم دونوں اسے گاؤں تک لے گئے مگر لڑکی کے دائیں گال پر دانتوں کے لال سُرخ نشان دیکھ کر مَیں سمجھ نہ سکا کہ یہ دانت چڑیل کے تھے یا شاہ جی کے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جب اس کمسن کنواری لڑکی کے گال پر گھر والوں نے دانتوں کے نشان دیکھے ہوں گے تو اس پر کیسے کیسے شک کر کے اسے کس بے دردی سے پیٹا ہوگا اور یہ تو مجھے یقین تھا کہ لڑکی کی اس بات کو کوئی بھی سچ نہیں مانے گا کہ یہ دانت شاہ جی کے ہیں۔

مَیں نے جب یہ سوچا تو لڑکی کو ہم نے اس کے گاؤں سے دُور ہی چھوڑ دیا اور اسے تسلی دی کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں، اب وہ چلی جائے۔ مجھے ڈر تھا کہ ہمارے ساتھ دیکھ کر کوئی اس پر شک نہ کرے۔ وہ سارا راستہ روتی رہی تھی اور اس نے ایک ہاتھ گال پر رکھا ہُوا تھا۔ میرے سامنے اس نے ہاتھ ہٹایا تو اس کے ہاتھ پر خون لگا ہُوا تھا۔ اپنے ہاتھ کو دیکھ کر وہ اور زیادہ رونے لگی اور روتی ہوئی اپنے گاؤں کو چل

پڑی۔ اس نے جاتے جاتے کہا۔ "جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اسے اللہ کوڑھی کر کے مارے گا"۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ایسے پسماندہ لوگوں میں جو پیروں کو خدا مانتے ہیں، ایک لڑکی ایسی بھی تھی جو پیر کو بد دعا دے رہی تھی۔ مَیں نے اپنے دوست سے کہا۔ "اب دیکھو خدا سچا ہے، یا یہ پیر اور اس کا چھوٹا شاہ جی"۔

وہ چلی گئی تو مَیں اور میرا دوست بہت دیر چُپ چاپ رہے۔ غالباً میری طرح وہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا یہ شاہ جی بدکار نہیں؟ اگر وہ بدکار ہے تو ہم بے غیرت ہیں۔ میرا دوست بول ہی پڑا۔ کہنے لگا۔ "صابو! میں اس کافر کو جتانا چاہتا ہوں کہ تم شاہ نہیں بدمعاش ہو اور اگر تم نے ہمارے گاؤں کی کسی لڑکی کو بُری نظر سے دیکھا، تو تمہارے باپ کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی.... تم کیا سوچ رہے ہو؟"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "مَیں سوچ رہا ہوں کہ اسے کس طرح ختم کریں اور لاش کہاں غائب کریں"۔ غصے سے میری آواز کانپ گئی۔ مَیں نے کہا۔ "اسے شکار پر ساتھ لے چلتے ہیں اور کوئی ایسی ترکیب سوچتے ہیں کہ افضل کا بوہلی اور میرا ٹیریا اسے چیر پھاڑ دیں۔ اگر ہمارے کتے یہ کام کر دیں تو ہم یہ مشہور کر سکتے ہیں کہ اس نے کتوں کو مارا تھا۔ ہم وہاں نہیں تھے۔ کتوں نے اسے اجنبی سمجھ کر مار دیا"۔

میرا دوست سوچ میں کھو گیا۔ وہ کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "بندوبست ہو جائے گا"۔

خدا گواہ ہے، آج پینتیس چالیس سال بعد وہ لڑکی اور اس کے گال پر شاہ جی کے اُترے ہوئے دانت یاد آتے ہیں تو غصے سے میرے دانت بجنے لگتے ہیں۔ وہ اُس کی منّت کر رہی تھی کہ شاہ جی مَیں کنواری ہوں۔ آج ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ

میری کنواری بیٹی تھی ـــــ وہ گندی آج بھی قائم ہے۔ بڑا پیر مر گیا ہے، وہ بہت ہی خوف ناک موت مرا تھا۔ وہ لڑکی بھی بوڑھی ہو کر مر گئی ہے مگر گندی زندہ ہے اور گندی کے عقیدت مند زندہ ہیں۔ مجھے ان سے کوئی ڈر نہیں۔ مَیں اعلانیہ کہہ رہا ہوں کہ یہ گندی گناہ خانہ ہے۔ اگر گندی نشین کو شک ہے تو میرے سامنے بیٹھے اور مَیں سارے علاقے کے لوگوں کو جمع کر کے کہوں گا کہ یہ گندی گناہوں کا مرکز رہی ہے اور اب بھی وہاں گناہ ہوتے ہیں اور اس کا محض وجود ایک ایسا گناہ ہے جس کے مجرم ہم سب ہیں جو اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی بجائے اس کی پُوجا کرتے ہیں۔

مَیں یہ بھی اعلانیہ کہتا ہوں کہ مَیں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر چھوٹے شاہ جی کو قتل کرنے کا پکّا ارادہ کیا تھا مگر خدا نے یہ کام خود ہی کر دیا تھا اور ہمیں اس نیکی سے محروم رکھا تھا۔ ایسے بدکار آدمی کو قتل کرنے کو مَیں آج بھی نیکی سمجھتا ہوں۔

میرے اور افضل کے زخم مل چکے تھے اور اب ہم اگلے شکار کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد شاہ جی میرا دوست بننے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے ڈر تھا کہ یہ راز فاش نہ کر دوں۔ وہ مجھ پر اور میرے دوست پر زیادہ ہی مہربان ہو گیا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے ہاتھ سے ایک تعویذ میرے بازو کے ساتھ اور ایک میرے دوست کے بازو کے ساتھ باندھ کر کہا۔ "جاؤ اب تمہیں ناگ بھی راستہ دے دیں گے اور بھیڑیے تمہیں دیکھ کر اندھے ہو جائیں گے"۔

مَیں نے اپنے بازو سے شاہ جی کے ہاتھ کا باندھا ہوا تعویذ کھول کر اسے دے

دیا۔ میرے دوست نے بھی تعویذ کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس پر جلالی حالت طاری ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کے واقعہ کے بعد ہم نے اسے پیر ماننا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے ہم پر رعب ڈالنے کے لیے آنکھیں بند کر کے پیروں کی طرح باتیں کیں اور یہ بھی کہا ـــــ "نقصان اٹھاؤ گے بدبختو! یہ تعویذ ببر شیر کو اندھا کر دیتے ہیں" ـــــ پھر اس نے ہمیں گنوار دیہاتی اور اپنے مرید سمجھ کر جب یہ کہا کہ تمہاری جوان بہنیں میرے دربار آ کر میرے آگے لیٹ جاتی ہیں تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــــ "سنو جناب شاہ جی! ہم یہ تعویذ نہیں باندھتے آؤ ہمارا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم نے ایک کنواری لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ روتی ہوئی گھر گئی تھی۔ یاد رکھو، اس معصوم کے آنسو تم سے انتقام لیں گے۔"

وہ کچھ گھبرایا تو ضرور تھا لیکن سارے علاقے پر اس کی حکمرانی تھی۔ اُس نے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی مگر فوراً ہی دوستانہ باتوں پر اتر آیا اور ہنسنے لگا۔ کہنے لگا ـــــ "تمہیں جوانی نے اور دس جماعتوں کی تعلیم نے اندھا کر دیا ہے۔ اللہ تم پر رحم کرے گا۔"

انہی دنوں خبریں ملنے لگیں کہ ہمارے گاؤں سے کوئی آٹھ کوس دُور ناگوں کے ایک جوڑے نے کئی مویشی ڈس کر مار ڈالے ہیں اور لوگوں کا راستہ بند کر دیا ہے۔ انہیں مارنے کے بہت جتن کیے گئے۔ سب ناکام رہے۔ دیہات کے لوگ مافوق الفطرت باتوں کو فوراً تسلیم کر لیتے ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ ناگ نہیں، جن ہیں جو ایک سو سال عمر پوری کر کے ناگ بن گئے ہیں۔ اب ایک سو سال بعد انسان کے روپ

میں آ جائیں گے۔

ہم منچلے، خطروں میں کود جانے والے ان ناگوں کے شکار کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن گاؤں میں ہم نے کسی کو نہ بتایا کہ ہم ناگوں کے شکار کو چلے ہیں ورنہ ہماری مائیں ہمیں زنجیروں سے باندھ دیتیں۔ میں نے اور میرے دوست نے چھوٹے شاہ جی کو ختم کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔ ہم اسے ملے اور کہا کہ ہم ناگوں کے شکار کو جا رہے ہیں اور اگر اس کے تعویذ واقعی ناگ کو اندھا کر سکتے ہیں تو ہمارے ساتھ شکار کو آئے۔

وہ تیار ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنا باز ساتھ لائے گا۔ اس نے کہا کہ وہ بڑے شاہ جی سے تعویذ لکھوا کر بازو سے باندھ کر آئے گا "تم دیکھنا ناگ کس طرح اندھے ہوتے ہیں" ـــــ مگر میں سوچ رہا تھا کہ میں اس بدکار شاہ کو کس طرح اندھا کروں گا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی انسان کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچانے کی نہیں سوچی تھی۔ اب میں ایک آدمی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے ساتھ لے جا رہا تھا ـــــ میں نے اپنے دوست سے ایک بار کہا تھا کہ یار، خدا ایسے بدکاروں کو سزا کیوں نہیں دیتا؟

دو روز بعد ہم سورج نکلنے سے بہت پہلے چل پڑے۔ شاہ جی سمیت ہم بارہ آدمی تھے۔ کتے تو تھے جن میں افضل کا بولہی بھی تھا۔ اب کے اچھو کی جیکی ساتھ نہیں تھی۔ دراصل اچھو ہم سے ناراض ہو گیا تھا کہ ہم نے اس کی جیکی کو بدنام کر دیا ہے۔ اس کی شکایت بجا تھی۔ ہم نے سارے گاؤں کو بتا دیا تھا کہ آج جیکی کی وجہ سے ہمارے کتے لڑ پڑے تھے اور بولہی نے اپنے مالک کو کاٹ

لیا تھا۔ اس سے اچھو کی ناک کٹ گئی تھی۔ وہ اپنی جبکی کے چال چلن کے خلاف ایک لفظ سننے پر آمادہ نہ تھا۔ بہر حال اُس کی ناراضگی کو ہم نے بہتر ہی سمجھا۔ اگر وہ جبکی کو ساتھ لے چلتا تو پھر وہی ہنگامہ ہو جاتا جس سے افضل اور میں زخمی ہو گئے تھے۔

ہم سب گاؤں سے نکلے۔ ہمیں شاہ جی کے گھر جا کر اُسے ساتھ لینا تھا۔ جب ہم گاؤں سے نکل رہے تھے تو گلیوں میں اور منڈیروں پر سب کی مائیں کھڑی ہمیں گالیاں دے رہی تھیں۔ انہوں نے میرے اور افضل کے زخم دیکھے تھے۔ ان کی گالیاں برحق تھیں۔ ان میں دو ماؤں کی آواز سب سے زیادہ بلند اور صاف تھی۔ ایک میری ماں کی، دوسری افضل کی ماں کی لیکن ہمارے باپ کھڑے ہنس رہے تھے۔

شاہ جی کے گھر گئے تو وہ تیار تھا۔ اُس نے باز ساتھ لے لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہمارے ساتھ ایک گھوڑا جا رہا تھا۔ ہم پاپیادہ گھوڑوں کی طرح دوڑا کرتے تھے۔ ہم نے اِدھر اُدھر سے پوچھ لیا تھا کہ ناگوں کا علاقہ کونسا ہے۔ راستہ بھی پوچھ لیا تھا۔ ہم بارہ آدمی، نو کتے، ایک گھوڑا اور ایک باز ناگوں کے شکار کو چل پڑے۔ ہم نے کتوں کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا۔ راستے میں ہم کوئی شکار نہیں کھیلنا چاہتے تھے کیونکہ ہمیں آٹھ کوس دُور جانا تھا۔ نہ ہم خود دوڑ کر تھکنا چاہتے تھے، نہ کتوں کو تھکانا مناسب سمجھا۔

راستہ لمبا تھا۔ یہ لمبے راستے گپ شپ اور اُدٹ پٹانگ بکواس سے چھوٹے ہو جایا کرتے ہیں مگر شاہ جی ساتھ تھے اس لیے ہم کوئی ایسا ویسا کلمہ منہ سے نکالتے

ڈرتے تھے۔ چپ چاپ تو ہم سے چلا نہ جاتا تھا۔ شاہ جی سے کہا کہ حضور کوئی بات سنائیں۔ حضور نے گھوڑے پر بیٹھے اپنی اور اپنے باپ کی کرامات سُنانی شروع کر دیں۔ اُن کا ہر معجزہ نرالا، دلچسپ اور سننی خیز تھا۔ ان میں ایک یہ تھا کہ ایک بار ایک آدمی بڑی دُور سے پیر صاحب کی زیارت کے لیے آ رہا تھا۔ راستے میں ایک برساتی نالہ آگیا جو اُس وقت سیلابی تھا۔ اس آدمی نے کہا "اے پیروں کے پیر! اگر تُو سچا پیر ہے تو پانی میں مجھے راستہ دے" ——— شاہ جی نے سنایا کہ وہ اُس وقت چھوٹے تھے۔ اپنے باپ کی گود میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے بازو لمبا کر کے اس طرح اوپر سے نیچے کو جھٹکا جس طرح تلوار چلائی جاتی ہے۔ میں ڈر گیا اور پوچھا کہ انہوں نے ایسے کیوں کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک آدمی نے سیلاب میں سے راستہ مانگا ہے۔ دو گھنٹے بعد ایک آدمی ان کے قدموں میں آ گرا اور اُس نے سنایا کہ اس نے ان کا نام لیا اور سیلاب میں ایک گلی بن گئی جس میں سے وہ گزر کر آیا ہے۔

اور دوسرا معجزہ یوں تھا کہ ایک روز پیر صاحب مٹی کے لوٹے سے وضو کر رہے تھے۔ اچانک انہوں نے لوٹا اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ہم نے دیکھا کہ لوٹے کا ایک ٹکڑا اُوپر کو اُڑا اور ایک سمت کو اُڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میری ماں نے گھبرا کر پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ پیر صاحب نے جواب دیا کہ ایک مرید کہیں سے آ رہا ہے۔ اسے راستے میں شیر نے روک لیا ہے۔ مجھے لوٹے کے پانی میں نظر آیا ہے ——— شام کے وقت ایک آدمی لوٹے کا وہی ٹکڑا اُٹھائے ہوئے پیر صاحب کے پاس آیا اور بتایا کہ اُسے ایک شیر نے روک لیا تھا۔ اچانک یہ ٹکڑا کہیں سے اُڑتا آیا اور شیر کے سر پر لگا۔ شیر وہیں اندھا ہو گیا اور وہ آدمی زندہ و سلامت

نکل آیا۔

شاہ جی سُناتا چلا جا رہا تھا۔ ہم دم بخود سُنتے چلے جا رہے تھے اور آٹھ کوس کا فاصلہ تیزی سے سمٹتا چلا جا رہا تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی نہ سوچا کہ ہمارے علاقے میں شیر کہاں ــــ صرف مَیں اور میرا دوست تھا جو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چُپ تھے۔ ہم نے پیر کی کرامات بڑی اچھی طرح دیکھ لی تھی۔ لیکن ہمارے ساتھی بہت متاثر ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک کتا غرّایا۔ تمام کُتوں کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ آزاد ہونے کے لیے زور لگانے لگے۔ ہم نے سامنے دیکھا۔ ایک خرگوش کوں کوں ایک سو گز دُور بھاگا جا رہا تھا۔

شاہ جی نے فوراً اپنے ہاتھ پر بٹھائے ہوئے باز کو اُس طرف متوجہ کیا اور باز کو چھوڑ دیا۔ مَیں نے باز کو پہلی بار اس عالم میں دیکھا تھا۔ وہ گولی کی طرح زمین سے دس بارہ گز بلندی پر اُڑتا خرگوش کی طرف گیا اور دُور جا کر پَر سمیٹے اور تیر کی طرح اُوپر اُٹھا۔ وہاں سے گھوما اور غوطے میں چلا گیا۔ ہمیں اب خرگوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب باز زمین سے لگ کر اُوپر اُٹھا تو خرگوش اس کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا مگر چند گز اوپر جا کر خرگوش اس کے پنجوں سے چھوٹ کر گر پڑا۔

اب ہمیں خرگوش نظر آنے لگا۔ اس کی رفتار سُست ہو گئی تھی اور وہ ہماری طرف بھاگا آ رہا تھا۔ باز پھر اوپر اٹھا اور جھپٹنے لگا۔ اب اس کا جھپٹا بے کار ہو گیا تھا کیونکہ خرگوش اچھل کر زیادہ آگے نکل آیا تھا۔ باز اوپر اٹھا تو خرگوش ہماری طرف دوڑا۔ شاہ جی نے کہا کوئی کُتا نہ چھوڑنا مگر ہمارے ایک دوست کے کُتے نے خرگوش کو دیکھ کر اتنی زور سے زنجیر کھینچی کہ زنجیر ہمارے دوست کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

کُتا بے حد تیز رفتار سے خرگوش کی طرف دوڑا۔ خرگوش زخمی تھا اور اوپر سے گرا تھا۔ اس لیے تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے کُتوں کو اور زیادہ مضبوطی سے جکڑ لیا لیکن جو کُتا آزاد ہو گیا تھا اسے سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔

کُتے نے خرگوش کو منہ میں ڈالا ہی تھا کہ اوپر سے باز نے کُتے کی گردن پر جھپٹا مارا۔ کُتے کے منہ سے خرگوش چھوٹ گیا اور کُتا پر سے جا پڑا۔ اب باز کا عقاب دیکھنے والا تھا۔ کُتے نے دَوڑ کر پھر خرگوش کو منہ میں لے کر جھنجھوڑا۔ اس کی نظر شاید باز پر بھی تھی۔ باز اس پر جھپٹے میں آ رہا تھا۔ جونہی باز قریب آیا۔ کُتے نے خرگوش کو چھوڑ کر اور تقریباً دو گز اچھل کر باز کو پنجے مارے۔ باز زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہیں سے گھوم گیا لیکن اس کے کئی ایک پَر جسم سے الگ ہو کر زمین پر آ رہے تھے۔ خرگوش تڑپ رہا تھا۔ اب کُتا خرگوش کو بھی پرے کھڑا دیکھ رہا تھا اور باز کو بھی۔

باز پہلے کی سی شان اور عقاب سے غوطے میں آیا اور جو داؤ اُس نے کھیلا، اُسے کُتا قبل از وقت نہ سمجھ سکا۔ وہ کُتے پر آ رہا تھا۔ کُتا اس کی طرف دوڑا اور اچھلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ باز قریب آیا تو کُتا اس کی طرف اچھلا لیکن باز نے وہیں سے رُخ بدل لیا اور سیدھا خرگوش پر آ کر خرگوش کو اٹھا لے گیا۔ کُتے کا جھپٹا خالی گیا۔ باز خرگوش کو اٹھائے ہوئے شاہ جی کے گھوڑے کے قریب آیا اور خرگوش کو پھینک کر شاہ جی کے ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنے کُتے کو دیکھا۔ اس کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ باز کے پنجوں نے اُس کی کھال چیر ڈالی تھی۔ شاہ جی کے کہنے پر سارے کا سارا خرگوش اسی کُتے کو دے دیا گیا۔

اتنا دلچسپ تماشا دیکھ کر ہماری ٹانگوں میں جان آ گئی اور ہم آگے چل پڑے۔ تھوڑا

ہی آگے جاکر پتھریلا اور چٹانی علاقہ شروع ہوگیا۔ یہی علاقہ تھا جہاں لوگوں نے بتایا تھا کہ ناگوں کا جوڑا رہتا ہے۔ ہم محتاط ہوکر چلنے لگے اور زمین پر سانپ کے نشان دیکھنے لگے۔ نشان دیکھتے دیکھتے ہم سب بکھر گئے۔ شاہ جی گھوڑے پر سوار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شکار پر میں نے پہلی دفعہ ڈر محسوس کیا کیونکہ ناگ سے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ بھیڑیے کا زخمی کیا ہوا انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن سانپ کا ڈسا ہوا زندہ نہیں رہ سکتا۔

میں نے شاہ جی کے قریب جاکر کہا — "حضور! تعویذ آپ کے پاس ہے نا؟" — شاہ جی نے جواب دیا "ہاں، ہاں، ڈرو نہیں۔ اژدہے راستہ دے دیں گے۔ یہ تو ناگ ہیں" — لیکن میں نے شاہ جی کی آواز میں صاف طور پر لرزہ محسوس کیا۔ مجھے تسلی دے کر بولا — "تم آگے جاؤ۔ میں آتا ہوں" — میں تو آگے چلا گیا۔ لیکن شاہ جی تعویذ سمیت پیچھے رہ گیا۔

میرا اہم راز دوست میرے ساتھ تھا۔ شاہ جی کو پیچھے رہتا دیکھ کر میرے دوست نے مجھے کہا — "صابو! کام آسان نظر نہیں آتا۔ اسے کسی بہانے گھوڑے سے اتارو" — میں نے بے شک غصے اور غیرت کے جوش میں شاہ جی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ وقت آیا تو میرا دل کانپنے لگا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ شاہ جی کو الگ کر کے کہہ دوں کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے ورنہ ہم انتقام لیں گے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے دوست نے یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھا دیا کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم ناگوں کو ماریں گے یا ناگوں کو اندھا کرنے والے کو — اس نے یہ بھی کہا — "میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ اسے کسی کھڈ میں لے چلتے ہیں اور

گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔ اس کے باپ سے اور گاؤں والوں سے کہیں گے کہ ہمیں ایک ناگ نظر آیا تھا۔ وہ فوراً انسان بن گیا اور اس نے چھوٹے شاہ جی کی گردن دبا کر مار دیا پھر غائب ہوگیا۔"

مجھے یہ ترکیب کچھ پسند آگئی۔ چھوٹے شاہ جی کے باپ نے لوگوں کو یہ تو یقین دلا ہی رکھا تھا کہ یہ ناگ چن ہیں۔

اتنے میں افضل نے آواز دی۔ ہم اس تک پہنچے۔ وہ جھکا ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ زمین پر سانپ کے رینگنے کے صاف نشان تھے۔ ہمارے دو تین ساتھی نشان کو دیکھتے آگے چل پڑے۔ شاہ جی نے کہا — "چلو بھائیو چلیں۔ پھر کبھی آئیں گے" — اور اس نے گھوڑے کو واپسی کے لیے موڑ لیا۔ وہ کم بخت ناگوں کے نشان دیکھ کر ہی ڈر گیا تھا۔ اس سے اس کے تعویذ اور کرامات کی قلعی کھل گئی۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ تعویذ سمیت چل پڑا تو ہم کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ہم اتنی دور سے آئے تھے، بچھڑ کر کے واپس جانا چاہتے تھے۔ ناگ کی صرف ٹیڑھی سی لکیر کو دیکھ کر بھاگ جانا ہم سب کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ہم نے دیکھا کہ شاہ جی بازو پر باز کو بٹھاتے بڑی شان سے تشریف لے جا رہے تھے۔

اچانک شاہ جی کا گھوڑا رک گیا۔ ہم کوئی بیس گز دور کھڑے تھے۔ دیکھا کہ گھوڑا تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کے منہ سے عجیب ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ہم دوڑ کر پہنچے۔ آگے وسیع کھڈ تھا۔ گھوڑا کھڈ کے منہ پر کھڑا تھا۔ ہم نے کھڈ میں دیکھا تو ہمارے اوسان خطا ہوگئے۔ دو سیاہ کالے ناگ کھڈ میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے پھن پھیلائے ہوئے گھوڑے کو گھور رہے تھے۔ گھوڑا ہو یا کوئی اور مویشی، اگر

سانپ سامنے آجائے تو اسی طرح دہشت سے کانپنے لگتا ہے۔ نہ آگے چلتا ہے نہ پیچھے۔

گھوڑا کانپ رہا تھا اور شاہ جی نے پاؤں رکابوں سے نکال کر گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ دیئے اور چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ناگوں نے شاہ جی کا راستہ روک لیا تھا۔ اور ان کا تعویذ بے اثر ہو رہا تھا۔ ہم سب پیچھے ہٹ آئے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کتوں کو ناگوں پر چھوڑیں یا نہ چھوڑیں۔ ڈر یہی تھا کہ کتے مارے جائیں گے۔ افضل نے بوملی کو آگے کر کے ناگوں کی طرف اشارہ کیا۔ بوملی نے جب ناگوں کو دیکھا تو وہ بھی گھوڑے کی طرح عجیب سی آواز نکال کر افضل کی ٹانگوں میں گھسنے لگا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ کتے ناگوں کا مقابلہ نہیں کریں گے۔

ناگ کالے تھے اور ان پر سفید نقطے بھی تھے۔ ان کے پھن پر وی (V) کے نشان تھے۔ دونوں ڈیڑھ ڈیڑھ گز سے زیادہ ہی لمبے تھے۔ ہم نے سانپوں کو اکثر دیکھا تھا کہ سانپ انسان کو دیکھ کر بھاگ جایا کرتے تھے۔ یہ پہلے سانپ دیکھے جو بپھر کر مقابلے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس سے مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ جن ہیں جنہوں نے روپ بدل لیا ہے۔ شاہ جی کی حالت دیکھ کر ہم اور زیادہ ڈر رہے۔ اُس کا گھوڑا بدستور کانپ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کس نے کہا ــــ "شاہ جی، باز کو چھوڑیئے" ــــ شاہ جی نے باز کی توجہ ناگوں کی طرف کر کے چھوڑ دیا۔

باز شاہ جی کے ہاتھ سے اُڑا اور اُوپر جا کر اس نے کھڈ کا چکر کاٹا۔ ناگ آہستہ آہستہ گھوڑے کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دوران میرے ساتھیوں نے درختوں کی موٹی موٹی شاخیں توڑ کر لاٹھیاں بنالی تھیں اور وہ ناگوں کے مقابلے کے لیے

تیار ہو گئے۔ جب ناگ اکٹھے گھوڑے کی طرف بڑھتے ہوئے کھڈ کی ڈھلان چڑھنے لگے تو گھوڑا نہایت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا اور اس کا لرزہ پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ میرے ساتھیوں کا ارادہ تھا کہ ناگوں کو پتھروں سے مارا جائے لیکن خطرہ یہ تھا کہ بھاگتے بھاگتے ہی ناگ کسی کو ڈس نہ جائیں۔

ہمارے دوست بھی وہیں آ گئے۔ انہوں نے کتوں کی زنجیریں کھولی نہیں تھیں۔ کتوں اور اتنے سارے انسانوں کو دیکھ کر ناگ سکڑنے لگے۔ ہم نے سب سے کہا کہ وہ وہاں سے ہٹ کر دُور ہو جائیں اور بکھر جائیں تاکہ ناگ جس طرف بھی بھاگیں انہیں بھاگنے کا راستہ نہ ملے۔ ہم نے شاہ جی سے کہا کہ وہ گھوڑے سے اُتر آئیں اور گھوڑا پیچھے کر دیں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ وہ گھوڑے سے اُترے تو اسے دھکا دے کر کھڈ میں گرا دوں گا۔ ناگ ہمارا کام کر دیں گے مگر شاہ جی کا دل گردہ جواب دے گیا تھا۔ میرے تمام ساتھی وہاں سے ہٹ گئے اور شاہ جی گھوڑے پر بیٹھا کانپتا رہا۔ اس کا باز اُوپر اُڑ رہا تھا۔

باز ناگوں کے عقب سے غوطے میں آیا۔ کیا شان تھی اس پرندے کی۔ ہماری سانسیں رُک گئی تھیں۔ باز نے پیچھے آ کر پنجے کھول لیے اور جھپٹا مار کر ایک ناگ کے پھن کو پنجوں میں دبوچ کر اُوپر کو اٹھا۔ ہم حیران تھے کہ اس میں اتنے بڑے ناگ کا بوجھ اُٹھانے کی طاقت تھی۔ اگر باز ناگ کو سر سے ذرا دُور سے پکڑتا تو ناگ اسے ڈس لیتا۔ اُس نے ناگ کا پھن پکڑ لیا تھا اور اُوپر ہی اُوپر اُڑا جا رہا تھا۔

عادت کے مطابق اسے شکار کو شاہ جی کے حوالے کرنا تھا۔ اُدھر دوسرا ناگ اپنے جوڑے کو نہ پا کر تیزی سے شاہ جی کے گھوڑے کی طرف آیا۔ گھڑا جو ہنہنا ٹاؤ ہو کر

تھرتھرکانپ رہا تھا ایک لحظہ دائیں طرف کو دوڑ پڑا۔ شاہ جی کے پاؤں اوپر تھے لیکن وہ شہسوار کی طرح سنبھل گیا اور پاؤں رکابوں میں رکھ لیے مگر گھوڑا خوفزدہ ہو کر بے قابو ہو گیا تھا ناگ گھوڑے کے پیچھے بھاگا۔ معلوم نہیں فاصلہ تین یا تین کوس گئے یا نہیں، اس قدر تیز دوڑتے گھوڑے کے تعاقب میں ناگ کی رفتار یہ تھی کہ گھوڑے سے دو تین گز دور تھا۔ شاہ جی نے گھوڑے کو بائیں طرف موڑ دیا اور ناگ درمیانی فاصلہ برقرار رکھے ہوئے دوڑ رہا تھا۔

اوپر سے باز ناگ کو پنجوں میں دبوچے شاہ جی کے اوپر اڑ رہا تھا۔ وہ شکار شاہ جی کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ گھوڑا ایک دائرے میں دوڑ رہا تھا اور ناگ تعاقب میں تھا۔ فاصلہ وہی تھا۔ شاہ جی نے گھوم کے دیکھا تو چلائے ــــ "صابر کتے چھوڑ دو۔ کتے چھوڑ دو" ــــ میں کتے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھے خدا نے موقع دے دیا تھا۔ کنواری بیٹی کی آہیں شاہ جی کو سزا دینے والی تھیں۔ مگر میرے ساتھیوں نے نو کے نو کتے چھوڑ دیئے۔ کتوں کے ساتھ ہمارا بھاگنا ضروری تھا مگر ڈر یہ بھی تھا کہ ناگ کسی کو ڈس نہ لے۔ پھر بھی ہم دوڑے اور کتے ہمارے ساتھ دوڑتے ہمارے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شکار کہاں ہے اور کیا ہے؟

شاہ جی کا گھوڑا چکر میں آیا تو افضل نے ڈھیلا اٹھا کر گھوڑے کے پیچھے بھاگتے ناگ کی طرف پھینکا۔ اس کے بوہلی نے ناگ کو دیکھ لیا۔ وہی بوہلی جو تھوڑی دیر پہلے ناگ کو دیکھ کر کانپنے لگا تھا اب گولی کی طرح دوڑا اور ناگ کے اوپر سے گزر گیا۔ ناگ نے لڑھکنی کھائی اور پھن پھیلا دیا۔ وہ رک گیا تھا۔ پیچھے سے ایک بل ٹیریر نے تیزی سے جا کر اس کے سر کے نیچے منہ مارا اور ناگ کو بھنبھوڑ کر چھوڑ دیا اور آگے نکل گیا۔ شاہ جی نے دیکھا کہ ناگ ان کے تعاقب سے ہٹ گیا ہے تو وہ گھوڑے کو سنبھالنے

کی کوشش کرنے لگا۔ مگر گھوڑا بے قابو ہو چکا تھا۔ باگیں کھینچنے کے باوجود رک نہیں رہا تھا۔

میرے دوست نے مجھے آہستہ سے کہا "اپنا کتا کسی طرح گھوڑے کے پیچھے ڈال دو" ــــ اس کا مقصد یہ تھا کہ گھوڑے کو اور زیادہ دہشت زدہ کیا جائے۔ شاید شاہ جی کو گرا دے۔ مگر ہمارے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ کتوں کو گھوڑے کے پیچھے ڈال سکتے۔ کتے اب ہمارے قابو میں سے نکل گئے تھے۔

بوہلی اور بل ٹیریر کی جرأت کو دیکھ کر باقی کتوں نے بھی ناگ کا محاصرہ کر لیا۔ ناگ پھن پھیلا کر ایک کتے کی طرف جھپٹتا تھا تو پیچھے سے کوئی اور کتا اسے دانت یا پنجہ مار کر دور ہٹ جاتا تھا۔ اوپر دیکھا تو باز دوسرے ناگ کو پنجوں میں دبوچے چکر میں اڑ رہا تھا اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ شاہ جی کا گھوڑا رک گیا تھا اور شاہ جی اس کی گردن پہ تھپکیاں دے رہا تھا۔ اس کی نظر گھوڑے پر تھی۔ اچانک اوپر سے باز نے پر تولے اور ناگ کو پنجوں میں دبوچے ان کے کندھے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ناگ کو شاہ جی کے گھوڑے پر پھینک دیا تھا۔

گھوڑے نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ اس کی پیٹھ پر ناگ رکھ دیا گیا ہے۔ وہ بدک کر دوڑ پڑا۔ میں نے ناگ کو گرتے نہیں دیکھا۔ ادھر کتوں کی طرف دیکھا تو ایک کتا چیخ اور تڑپ رہا تھا۔ اسے ناگ نے ڈس لیا تھا لیکن ناگ کا بھی دم خم ختم ہو چکا تھا۔ کتوں نے پنجے مار مار کر اسے لہولہان کر دیا تھا اور اس کا پھن زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے جب بے بس ہو کر پھن سمیٹا تو بارہ کے بارہ شکاری درختوں کی موٹی شاخوں سے اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے مار ڈالا۔

شاہ جی کو دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی

دے رہی تھی جو دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم نے کُتوں کو زنجیریں ڈالیں اور مَیں نے سب کو بتایا کہ بازنے ناگ شاہ جی کے گھوڑے پر پھینک دیا تھا جس سے گھوڑا بدک کر بھاگ اُٹھا ہے۔ ہم دَوڑ پڑے۔ راستے میں ہمیں ناگ نظر آیا۔ اس کے سر سے خون بہ رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ ہم نے اسے پتھروں اور درختوں کی شاخوں سے مار ڈالا۔ دوڑ دوڑ کر تھک گئے تو ہم چلنے لگے۔ راستے میں تین چار آدمی ملے۔ انہوں نے پوچھا کہ گھوڑے پر کون تھا؟ ہم نے بتایا تو وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑے۔ انہوں نے بتایا کہ شاہ جی کا پاؤں رکاب میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ گر پڑے تھے اور گھوڑا انہیں گھسیٹتا لے جا رہا تھا۔ شاہ جی کا مرجانا یقینی تھا۔

ہم اور تیز چلنے لگے۔ دُور سے ہم نے بہت سے آدمیوں کو اِدھر اُدھر سے دَوڑتے ہوئے آتے دیکھے۔ وہ ایک ہی سمت دَوڑے جا رہے تھے اور کہیں اُتر کر غائب ہوتے جا رہے تھے۔ ہم بھی دوڑ پڑے۔ آگے ٹیلے کے دامن میں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ دیکھا کہ شاہ جی کی لاش پڑی تھی۔ سر سے پاؤں تک خون سے لال سرخ۔ کپڑے تار تار ہو گئے تھے اور گھوڑا پرے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ باز زمین پر بیٹھا تھا۔

مَیں نے دیکھا کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں چند ہی دن پہلے شاہ جی نے ایک نوجوان لڑکی کو دبوچا تھا۔ مَیں نے شاہ جی کی لاش کو دیکھا اس کے بازو کے ساتھ وہ تعویذ بندھا ہوا تھا جسے دیکھ کر سیلاب، ناگ اور درندے راستہ دے دیا کرتے ہیں۔

اس کہانی کا عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ شاہ جی کے چہرے کی حالت یہ تھی جیسے اُسے درندے پنجوں سے نوچتے رہے ہوں۔ چہرے کی ہڈیاں ننگی ہو گئی تھیں۔ ہونٹ کٹ کر الگ ہو گئے تھے۔ دانت ڈراؤنے طریقے سے ننگے ہو گئے تھے۔ ایک طرف کا

سارا جبڑا ننگا ہو گیا تھا اور کھال الگ لٹک رہی تھی۔ اُس وقت مجھے لڑکی کا گال یاد آیا جس پر شاہ جی کے دانتوں کے سرخ سرخ نشان صاف نظر آ رہے تھے اور اس کی وہ التجا بھی یاد آئی "شاہ جی! خدا کی قسم مَیں کنواری ہوں۔"

وہ گدّی آج بھی موجود ہے اور لوگ وہاں سے تقدیر اور اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کے عوض تعویذ لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس گدّی کے تعویذ ناگوں کو اندھا کر دیتے اور آندھیاں روک لیتے ہیں۔

دو قبروں کی کہانی

وہ دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے تھے۔
دونوں مارے گئے لیکن وہ ایک دوسرے کے قاتل نہیں
تھے۔ بھیڑیوں نے ان کی قبریں اکٹھی بنائیں۔

جوانی

کے ہنگامہ خیز دَور کو یاد کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی ایسی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ مگر اب جب کہ مَیں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں، دو چیزیں مجھے اُس دَور کے ہر ایک لمحے کو یاد کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ایک تو "حکایت" کے ایڈیٹر کا خط ہے جو آتا ہے تو اس میں یہی ایک فرمائش ہوتی ہے کہ مَیں شکار کی اگلی کہانی کب بھیج رہا ہوں۔ مَیں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی وقت مجھے یہ کہانیاں لکھنی بھی پڑیں گی اور جناب عنایت اللہ صاحب مجھے ادیب بنا دیں گے۔ ہم تو کتّوں سے شکار کھیلنے والے دیہاتی تھے۔ کتّے اور قلم کا تو کوئی جوڑ اور کوئی رشتہ ہی نہیں ہوتا۔ لیکن کتّے چھوڑ کر قلم ہاتھ میں لینا پڑا۔ اور اب قلم مجبور کرتا ہے کہ لڑکپن اور جوانی کو یاد کروں اور جو اچھی بُری بات یاد آئے لکھتا چلا جاؤں۔

دوسری چیز جو مجھے گھسیٹ کر بڑھاپے سے جوانی کے دَور میں لے جاتی ہے وہ اپنے گاؤں کا قبرستان ہے۔ وہاں ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ کے شہیدوں کی قبریں بھی ہیں۔ ان میں دسمبر ۱۹۷۱ نے دو قبروں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اِن آٹھ قبروں کو دیکھ کر اپنا گاؤں بہت ہی اچھا نظر آنے لگتا ہے جس کی ماؤں نے آٹھ جوان بیٹے پاکستان کے مقدّس نام پر قربان کر دیئے ہیں۔

اس قبرستان میں چند قبریں ایسی ہیں جو دیکھتا ہوں تو مجھے بچپن، لڑکپن اور جوانی کا ایک ایک لمحہ یاد آ جاتا ہے۔ یہ میرے بچپن کے دوستوں کی قبریں ہیں۔ مَیں نے آپ کو اپنی پہلی کہانی "لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ" میں اور دو اور کہانیوں میں بھی سُنایا تھا کہ میرے چند ایک دوست کس طرح شکار کھیلتے مر گئے تھے — اور باقی جو تھے وہ زندگی کے سفر میں ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔

اب مَیں ہوں اور میرا ایک شکاری دوست شاہباز خان رہ گیا ہے۔ معلوم نہیں دونوں میں سے کون پہلے رخصت ہو گا۔ ہم دونوں کبھی کبھی آہستہ آہستہ چلتے گاؤں سے دُور نکل جاتے ہیں۔ یہاں ہم کبھی آہستہ نہیں چلے تھے۔ ہم دوڑا کرتے تھے۔ کھڈ نالے تازی کتّوں کی طرح پھلانگا کرتے تھے مگر اب تو جیسے ہم دھرتی کا بوجھ بن گئے ہیں۔ اپنے جسم کا وزن گھسیٹا نہیں جاتا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ ہم نے اپنی جوانی اپنے بچّوں کے جسموں میں منتقل کر دی ہے۔ یہی ایک ورثہ تھا جو بچّوں کو دے چلے ہیں یا یہ کہانیاں جو شاید بچّوں کا لہو گرمانے کے کام آ سکیں۔

مَیں اور راجہ شاہباز خان جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ہم آدھی صدی کی یادیں تازہ نہیں کیا کرتے۔ آج کی سیاسی باتیں بہت کیا کرتے ہیں کیونکہ ان میں ہمیں زیادہ

لطف ملتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سیاست کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ راجہ شاہباز خان۔ وہ اپنی رائے دیتا ہے، میں اپنی ہانکے جاتا ہوں۔ اور اس طرح ہم دونوں سیاستدان بن جاتے ہیں۔ جس موضوع کے متعلق آپ کچھ بھی نہ جانتے ہوں اس کے متعلق باتیں کرتے بہت لطف آتا ہے۔ کیوں کہ آپ اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ آپ اس موضوع کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔

جب ہم سیاست کے موضوع سے ہٹتے ہیں تو آج کل کے نوجوانوں کی دُبلی پتلی ٹانگیں اور ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے ہمارا موضوع ہوتے ہیں۔ ہم دونوں ایک روز راولپنڈی چلے گئے تھے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتے رہے۔ راولپنڈی شہر تو ہزار بار دیکھا تھا۔ اب گئے تو ہم مال روڈ پر راولپنڈی کی نئی نسل کو دیکھتے رہے۔ ہم شام کو واپس آئے۔ اتنی سیر کے بعد دل خوش ہونا چاہیے تھا مگر ہم اداس تھے کیونکہ ہم نے دیکھا تھا کہ لڑکوں کے بال لمبے ہو گئے ہیں اور لڑکیوں نے بال کٹوا دیے ہیں۔ خدا کی قسم کئی ایک لڑکے اور لڑکیاں ایسی بھی دیکھیں جن کے متعلق ہم نہیں بتا سکتے تھے کہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ جیسے قدبُت اور جسم مجنثے لڑکیوں کے دیکھے ویسے ہی لڑکوں کے نظر آئے۔ پھر یہ دیکھ کر ہمیں اور زیادہ افسوس ہُوا کہ لڑکیوں میں مردانہ بہر دپ دھار کر بھی مردانگی نہیں آئی البتہ لڑکوں میں نسوانیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ اُس قوم کی اولاد ہے جس نے آدھی دنیا پر حکومت کی تھی۔

میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کہانی سننا چاہتے ہیں اور میں نے وعظ شروع کر دیا ہے۔ تو آیئے، میں آپ کو کہانی پہلے سنا دیتا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں اور راجہ شاہباز خان کبھی کبھی قبرستان میں چلے جاتے ہیں۔ اپنے مرحوم دوستوں کی قبروں

پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ تمام قبریں پختہ ہیں۔ اُن سے ہم اپنی چادروں سے گرد جھاڑتے ہیں۔ کسی قبر کی کوئی اینٹ یا ٹائیل اکھڑی ہوئی ہو تو فوراً سیمنٹ سے جما دیتے ہیں۔ پھر ہم دونوں گئے گزرے وقت کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔

ان قبروں میں ہماری بہت سی کہانیاں دفن ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو آج بھی یاد آتی ہیں تو ہنسی نکل جاتی ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کی یاد آنسو نکال دیتی ہے۔ اِن قبروں میں کچھ راز بھی دفن ہیں جو ہم نے اپنے آپ سے بھی چھپا رکھے ہیں۔ میں اور راجہ شاہباز خان یہ راز اپنی اپنی قبروں میں لے جائیں گے۔ کسی کو نہیں بتائیں گے —— ہمارے قبرستان میں دو قبریں ایسی ہیں جن میں ایک ہی کہانی دفن ہے۔ یہ ہمارے دو دوست تھے۔ ان میں ایک ہماری شکاری پارٹی کا سرگرم اور دلیر رکن تھا اور دوسرا ایک ہی بار ہمارے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اس شکار پر دونوں ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ وہ بھرپور جوانی میں مر گئے تھے۔ ان کی آپس میں دوستی نہیں بلکہ ایسی دشمنی تھی جو قتل اور پھانسی سے بھی ختم نہیں ہُوا کرتی، نسل بہ نسل زندہ رہتی ہے اور زندہ رکھی جاتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے تھے لیکن موت سامنے آئی تو بات ہی کچھ اور ہو گئی۔ وہ اکٹھے لہولہان ہو کر گرے مگر وہ ایک دوسرے کے قاتل نہیں تھے —— ایک کا نام اسلم تھا اور دوسرے کا رزاق۔

میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہمارے علاقے میں خاندانی عداوت کا رواج عام تھا جو ابھی تک موجود ہے۔ راضی نامے اور سمجھوتے کو لوگ اپنی توہین سمجھا کرتے تھے۔ زیادہ تر جھگڑے نہایت معمولی باتوں سے شروع ہوتے تھے اور آنے والی نسلوں تک ورثے کے طور پر جاتے تھے۔ میرے گاؤں میں ایسے جھگڑے آج بھی چل رہے

ہیں جو میرے بچپن کے زمانے میں شروع ہوتے تھے۔ اُس زمانے سے لے کر اب تک بہت سے آدمی قتل ہو چکے ہیں اور دونوں طرف سے چند ایک آدمی پھانسی چڑھ گئے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو جوانی کا زمانہ جیل خانوں میں گزار کر بوڑھے ہو کے واپس آئے تھے۔ مگر جھگڑا ختم نہیں ہُوا۔

اسلم اور رزاق کے خاندانوں کے درمیان ایک لڑکی کے رشتے کے سلسلے میں دشمنی شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ یہ فتنہ لڑکی والوں نے پیدا کیا تھا۔ ان کی لڑکی جوان ہوئی تو رشتہ مانگنے والے اُن کے گھر جانے لگے۔ لڑکی کے والدین نے بیک وقت دو گھرانوں کو رشتہ دینے کا وعدہ کر دیا۔ ایک گھرانہ اسلم کا تھا۔ دوسرا رزاق کا تھا۔ اُس وقت اسلم اور رزاق بہت چھوٹے تھے۔ دونوں گھرانے رسم و رواج کے مطابق لڑکی والوں کی خاطر و مدارات کرنے لگے۔ مثلاً عید آئی تو دونوں گھرانوں نے لڑکی کے گھر کپڑے اور روپے بھیجے۔ لڑکی کے والدین نے دونوں کے تحفے رکھ لیے۔ دونوں گھرانوں کو علم ہو گیا کہ لڑکی والوں نے دونوں کو زبان دے رکھی ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ دونوں لڑکوں کے والدین لڑکی والوں سے کہتے کہ وہ کسی ایک کے ساتھ بات پکی کریں۔ اس کی بجائے انہوں نے بڑھ چڑھ کر لڑکی کے گھر تحفے بھیجنے شروع کر دیئے جس طرح نیلام میں لوگ بڑھ چڑھ کر بولی دیتے ہیں۔

لڑکی والوں کے کردار کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ وہ دونوں فریقوں کے تحفے قبول کرتے رہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے تحفوں کی تشہیر سارے گاؤں میں کرتے تھے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں گھرانوں کے درمیان کھچاؤ پیدا ہو گیا جس کا

نتیجہ سب کو معلوم تھا کہ کیا ہوگا۔ گاؤں کے بزرگوں نے لڑکی والوں کو شرمسار کیا اور کہا کہ وہ کسی ایک کے ساتھ بات پکی کر دیں ورنہ گاؤں میں خون ہو جائے گا۔ وہ اپنی حرکت سے باز آ گئے اور ایک گھرانے سے بات پکی کر دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے گھرانے کے دیئے ہوئے تحفے واپس کرنے گئے۔ اُس گھرانے نے تحفے واپس نہ لیے اور کہا کہ تم لوگوں نے ہمیں زبان دی تھی۔ وہ پوری کرو۔ یہ ہماری بے عزتی ہے۔

دوسری طرف دن بھی مقرر ہو گیا مگر دوسرے گھرانے نے ہار نہ مانی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ لڑکی کا رشتہ نہیں چھوڑیں گے۔ جب اصل دولہا کی بارات آئی تو دوسری طرف سے اُس لڑکے کی بھی بارات آ گئی جس کے رشتے سے انکار کیا گیا تھا۔ دونوں طرف کے باراتی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ اصلی بارات والوں کو نقلی بارات کے عزائم کا علم ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ لڑائی کی پوری تیاری کر کے آئے تھے۔ گاؤں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ وہاں دونوں باراتوں کا تصادم ہُوا اور کھلی جنگ لڑی گئی۔ دونوں پارٹیوں کے ساتھ میراثی تھے جو ایک طرف کھڑے اپنی اپنی پارٹی کے حکم کے تحت ڈھول بجاتے رہے۔ ہم ابھی بچے تھے۔ کوٹھوں پر کھڑے ہو کر تماشا دیکھا تھا۔ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑی تھیں۔

مولوی صاحب، گاؤں کے شاہ جی اور بزرگوں نے بڑی مشکل سے لڑائی ختم کرائی۔ دونوں طرف مرا تو کوئی نہیں، زخمی بہت ہوئے تھے۔ اصل بارات والوں کا پلّہ بھاری تھا کیونکہ انہوں نے تین چار گاؤں سے اپنی برادری کے آدمی بلائے ہوئے تھے۔ ان کی تعداد زیادہ تھی۔ آخر وہیں راضی نامہ کرایا گیا اور جسے رشتہ دیا گیا تھا اس کی بارات لڑکی کو ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ لڑکی والے کمزور تھے اس لیے غیر جانبدار رہے۔

یہاں سے کبھی ختم نہ ہونے والی دشمنی شروع ہوگئی۔ اُس وقت اسلم اور رزاق بھی میری طرح بچے تھے۔ اکٹھے کھیلتے اور خوش رہتے مگر جوں جوں اُن کا شعور بیدار ہوتا گیا اُن کے بزرگ ان معصوم دوستوں کی رگوں میں عداوت کا زہر ڈالتے رہے۔ اس زہر نے لڑکپن میں ہی اثر دکھا دیا اور اسلم اور رزاق بارہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے بزرگوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے۔ ان کی بول چال بند ہوگئی لیکن مجھے ابھی تک یاد ہے کہ دونوں کو یہ دشمنی پسند نہیں تھی۔ ہم سب بچے جب مل بیٹھ کر کھیلتے تھے تو وہ دونوں ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے اُن کے درمیان نظر نہ آنے والی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کے دلوں میں جو پیار ہے وہ مر نہیں سکتا اور اسے کوئی بھی مار نہیں سکتا۔

اسلم اور رزاق غالباً پندرہ پندرہ سال کے تھے تو اُس وقت تک ان کے خاندانوں کے درمیان دو معرکے لڑے جا چکے تھے۔ ایک میں اسلم کا بڑا بھائی مارا گیا تھا اور رزاق کے خاندان کے تین آدمی ایسی بُری طرح زخمی ہوئے تھے کہ پانچ چھ مہینے بعد کام کاج کے قابل ہوئے۔ ایک طرف کے آٹھ اور دوسری طرف کے گیارہ آدمی گرفتار ہوئے تھے۔ زمینیں ہندو ساہوکاروں کے پاس گروی رکھ کر قرضے لیے جن میں سے دونوں فریقوں نے پولیس کو دل کھول کر رشوت دی، مقدمہ لڑا۔ اور جھوٹے گواہوں کے پیٹ بھرے۔ اسلم کے بھائی کے قتل کی کسی کو سزا نہ ملی۔ بلوہ اور دنگا فساد کرنے کے جرم میں دونوں فریقوں کے کچھ آدمیوں کو دو دو سال سزائے قید ملی اور اپیل میں سارے ہی بری ہوگئے۔

قتل کا بدلہ لینا ضروری تھا ورنہ ناک کٹنے کا خطرہ تھا۔ اسلم کے دوسرے بھائی اور ایک چچا نے اسلم کے مقتول بھائی کا بدلہ ایسے طریقے سے لیا کہ ہر کسی کو اُن پر شبہ

شبہ ہونے کے باوجود انہیں گرفتار بھی نہیں کیا جا سکا تھا۔ مقتول رزاق کا ماموں تھا جسے رات کے وقت قتل کیا گیا تھا۔ اس کی لاش ایک کھڈ میں پڑی ملی تھی۔ اسی رات بارش نے لاش کے ارگرد سے پاؤں کے نشان دھو ڈالے تھے۔ پولیس کے پاس شک کے سوا گرفتاری کا اور کوئی جواز ہی نہیں تھا اور رشوت بھی کام کر گئی تھی۔ اب اس قتل کا بدلہ تو اور زیادہ ضروری ہو گیا تھا کیونکہ قانون بے بس ہو گیا تھا۔ پولیس قاتل کو پکڑنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ اسلم کا چچا قتل ہو گیا۔

یہ قتل بھی ایسے طریقے سے کیا گیا کہ قاتل کو قتل کرتے دیکھ کر بھی قانون اسے پکڑ نہ سکا۔ قاتل رزاق کا دوسرا ماموں تھا۔ وہ فوج میں ملازم تھا۔ اس کی پلٹن راولپنڈی آگئی۔ ایک شام رزاق کے اس ماموں کو گاؤں والوں نے گاؤں میں دیکھا۔ وہ کئی لوگوں سے ملا اور بتایا کہ وہ ایک ہفتے کی چھٹی آیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد چھ سات آدمیوں نے اسے اپنے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھا۔ دوسری طرف سے اسلم کا چچا آ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پرے سے ہی دوسری گلی میں گھوم گیا۔ رزاق کا ماموں اس کے پیچھے گیا۔ تب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اُس کے پاس کلہاڑی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد گاؤں میں شور اُٹھا ــــ "مار دیا۔ مار دیا۔ خون ہو گیا" ــــ لوگ دوڑ کر پہنچے۔ شام ہری ہو گئی تھی۔ اسلم کا چچا تڑپ رہا تھا۔ اس کا سر دو جگہوں سے کھل گیا تھا۔ کلہاڑی نے کھوپڑی کے تین ٹکڑے کر دیئے تھے۔ وہ ایک دو منٹ میں مر گیا۔ اس کے بعد رزاق کے ماموں کو گاؤں میں کسی نے نہ دیکھا۔

اُس پر شبہ پختہ تھا۔ پولیس نے اس کے گھر کی تلاشی لی۔ گھر والوں نے بیان دیا کہ وہ تو راولپنڈی اپنی پلٹن میں ہے۔ گاؤں میں کیسے آ سکتا ہے۔ تیسرے دن وہی کلہاڑی

جس سے رزاق کے ماموں نے اسلم کے چچا کو قتل کیا تھا، ایک میل دُور ایک کس میں پڑی ملی۔ پولیس راولپنڈی قاتل کی ملیشیا میں گئی تو وہاں اسے بتایا گیا کہ وہ تو قتل کی شام ڈیوٹی پر تھا۔ پولیس مجبور ہوگئی۔ موقعہ کے گواہ لیے کار ہو گئے اور یہ قتل بھی پولیس کی فائلوں میں دفن ہوگیا لیکن مقتول کے رشتہ داروں نے قاتل کو بخشا نہیں بلکہ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر اسے سزائے موت دے دی۔

یہ کامیابی انہوں نے اس طرح حاصل کی کہ رزاق کا ماموں قتل کے تین مہینے بعد چھٹی آیا۔ اس نے گھر والوں کو خط لکھ دیا تھا کہ وہ آرہا ہے مگر خط نہ پہنچ سکا۔ اگر خط مل جاتا تو گھر والے سٹیشن تک چلے جاتے اور اسے اپنی حفاظت میں لے آتے۔ گھر والوں کو علم ہی نہیں تھا۔ گھر والوں کو اُس وقت علم ہوا جب کچھ راہ گیروں سے پتہ چلا کہ فلاں جگہ لاش پڑی ہوئی ہے۔ بہت عرصہ بعد یہ راز کھل گیا تھا کہ خط کسی طرح اسلم کے رشتہ داروں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور وہ راستے میں بیٹھ گئے تھے۔ ریلوے سٹیشن بہت دُور تھا۔ مقتول کو اکیلے ہی گاؤں تک آنا پڑا۔ راستے میں کھڈ نالے اور ویران علاقہ تھا۔ دشمن گھات میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اسے ختم کر دیا۔ اور یہ قتل بھی ثابت نہ ہو سکا۔ گرفتاریاں ہوئیں لیکن سزا کسی کو بھی نہ ہوئی۔

اب پیچھے اسلم رہ گیا تھا۔ اس کا ایک بھائی زندہ تھا۔ اسے ماں باپ نے فوج میں بھرتی کرا دیا۔ اسلم کی عمر اٹھارہ انیس سال ہوگئی تھی۔ رزاق کی بھی یہی عمر تھی۔ ان دونوں کو ماں باپ نظروں سے اوجھل نہیں کرتے تھے۔ ہم بھی جب اِن دونوں کی جوانی کو دیکھتے تھے تو بہت افسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ معلوم نہیں کس وقت اور کہاں قتل ہو جائیں۔ ان کی قسمت میں قتل ہونا ہی لکھا تھا۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک قتل ہو جاتے اور دوسرا پھانسی چڑھ جائے۔ ہم سب ساتھی اکثر سوچا کرتے تھے کہ انہیں کس طرح بچایا جائے۔ گاؤں کے بزرگوں نے دونوں کے بزرگوں کو کئی بار کہا تھا کہ راضی نامہ کر لیں اور ناگہانی موت سے نجات حاصل کریں لیکن کوئی بھی فریق سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہُوا۔

اسلم ہماری شکاری پارٹی کا لڑکا تھا لیکن اُس کے ماں باپ اسے گاؤں سے دُور جانے نہیں دیتے تھے۔ ہم سب دوستوں نے مل کر اس کے ماں باپ کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے اور اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی اسلم کی ضد بھی کام کر گئی اور وہ ہمارے ساتھ شکار پہ جاتا رہا۔ اس کے بغیر ہمارے کُتوں کی ٹیم نامکمل ہو جاتی تھی کیونکہ تازی کُتا اسلم کا تھا۔ میں نے آپ کو پہلی کہانیوں میں بتایا ہے کہ تازی کُتا شکاری ٹیم کا انتہائی ضروری کُتا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دُبلے پتلے جسم اور رفتار کی تیزی کی وجہ سے بھاگتے شکار کو جا لیتا ہے۔ لڑ تو نہیں سکتا نہ خونخوار ہوتا ہے لیکن شکار کو روکے رکھتا ہے۔ اتنی دیر میں دوسرے کُتے پہنچ جاتے ہیں۔

اسلم تو سولہ سال کی عمر سے ہمارے ساتھ شکار کھیل رہا تھا۔ رزاق بھی ہمارا ہم عمر تھا لیکن شکار کا شوق نہیں تھا۔ البتہ دوستی بڑی پکی تھی۔ اس عمر تک اسلم اور رزاق کی بول چال تو بند ہو چکی تھی لیکن ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے دلوں میں دوستی قائم ہے۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں آکر ان کے چہرے بھی بدل گئے۔ اُس وقت تک اُن کے جو رشتہ دار قتل ہو چکے تھے اور جس طرح قتل ہوئے تھے وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان کے دلوں میں دوستی قائم رہے۔ آخری قتل کے بعد اچانک رزاق کو شکار کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس نے ہمیں کہا کہ اگلی بار وہ

ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہم سب دوست اس وجہ سے بہت خوش ہوتے کہ اسے باہر لے جا کر سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ تم اور اسلم جوان ہو اور تمہارے سامنے بڑی لمبی عمر پڑی ہے۔ تم دونوں نے ابھی شادی بھی نہیں کی۔ تمہارے بوڑھے ماں باپ، چچے، تائے اور ماموں، کچھ تو قتل ہو چکے ہیں اور باقی اپنی آئی پر مر جائیں گے۔ کم از کم تم دونوں دشمنی ختم کر دو اور جتنی دیر ہمارے ساتھ رہتے ہو آپس میں بولتے چالتے رہا کرو اور پیار سے رہو۔

جس روز رزاق نے شکار کے شوق کا اظہار کیا اُس روز مَیں نے اور راجہ شاہباز خان نے اسے الگ لے جا کر یہ باتیں کہیں۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے آہ بھری اور منہ پھیر لیا تھا۔ مَیں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے جنہیں اُس نے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ مَیں نہیں سمجھ سکا کہ اس کے آنسو کیوں نکلے تھے۔ شاید اسے اپنے وہ بزرگ یاد آ گئے تھے جو قتل ہو گئے تھے، یا شاید اسے اسلم کی محبت یاد آ گئی تھی جو مار دی گئی تھی۔ اُس نے آہ لے کر اور ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر بہت دھیمی آواز میں کہا تھا "مَیں مجبور ہوں۔"

پانچ چھ دنوں بعد ہم شکار کے لیے نکلے۔ رزاق بھی آ گیا۔ وہ خوش طبع نوجوان تھا لیکن میں نے دیکھا کہ اُس روز وہ چپ چاپ تھا اور مَیں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ گھبرایا ہوا بھی ہے۔ مجھے شک ہونے لگا۔ شک کی وجہ صاف تھی۔ اسلم اور رزاق دشمن تھے اور اب دونوں عمر کے اس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں نوجوان چٹانوں سے بھی ٹکرا جاتے ہیں۔ ہمیں بھی یہی ڈر تھا کہ رزاق ایسی ویسی نیت لے کر تو نہیں آیا؟ — یہ سوچ کر مَیں نے اس کی ہر حرکت کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ شکار پر جاتے ہم بکھر جایا کرتے تھے۔ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹ کر گپ شپ لگاتے جاتے تھے۔

کبھی شکار کے تعاقب میں دوڑ پڑتے تھے — مَیں نے رزاق کو دیکھا کہ وہ کبھی بھی اسلم کو غور سے دیکھتا تھا پھر دوسرے لڑکوں کو دیکھنے لگتا تھا۔ مَیں نے اپنے دوستوں کو پہلے سے خبردار کر رکھا تھا کہ اسلم اور رزاق کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ اب رزاق کی نظروں اور حرکتوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ شکار کے دوران اسلم پر وار کرنا چاہتا ہے۔

شکار پر کسی کو قتل کر دینا مشکل نہیں تھا۔ لڑکے شکار کے پیچھے بھاگتے، کھڈوں اور نالوں میں اکیلے اکیلے چلے جایا کرتے تھے جہاں کسی کو قتل کر کے کہہ دینا کہ معلوم نہیں کون قتل کر گیا ہے کوئی مشکل نہیں تھا۔ مَیں نے آپ کو ایک کہانی میں سنایا تھا کہ مَیں نے بھی ایک آدمی کو قتل کرنے کے لیے شکار کی ہی آڑ لی تھی۔ یہ ہمارا چھوٹا شاہ جی تھا جسے مَیں تو قتل نہ کر سکا۔ البتہ خدا نے اُسے کیے کی سزا دے دی تھی اور وہ بڑی ہی بے عزتی کی موت مرا تھا۔

شکار پر جانے سے ایک ہی دن پہلے مَیں نے اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے کہا تھا کہ رزاق اور اسلم کو سمجھایا جائے کہ وہ کم از کم جتنی دیر ہمارے ساتھ رہیں دل سے ایک دوسرے کی دشمنی نکال دیا کریں۔ ہم سے الگ ہو کر جو جی میں آئے کریں۔ دوستوں نے یہ کام میرے سپرد کر دیا کیوں کہ مَیں اندھوں میں کانا راجہ تھا۔ مَیں نے پسماندگی کے اُس دور میں دس جماعتیں پاس کی تھیں جب چار جماعت پاس کو تعلیم یافتہ کہا جاتا تھا اور دیہات میں میٹرک پاس تو عجوبہ ہوتا تھا۔ چار جماعت پاس کوئی خال خال ہی نظر آتا تھا۔ مَیں چونکہ دس جماعت پاس تھا اور میرے خاندان کا زمیندارہ بھی اللہ کے کرم سے وسیع پیمانے کا تھا اس لیے میری رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ یعنی مجھے سیانا سمجھا جاتا تھا کیونکہ میرے گھر والے تھے۔

دوسرے دن ہم شکار کو چل پڑے۔ میں نے رزاق کی حرکتوں کو مشکوک سمجھا تو میں نے راجہ شاہباز خان کو ساتھ لے کر پہلے اسلم کو الگ کر کے کہا کہ وہ کم از کم شکار کے دوران کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرے جس سے اس کا رزاق کے ساتھ جھگڑا ہو جائے۔ اسلم نے وعدہ کیا کہ اس کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوگی۔ اُس نے یہ بھی کہا ــــ "میں بچہ نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ رزاق آج شکار پر کیوں آیا ہے۔ دو دن ہوئے مجھے اس کی دھمکی مل چکی ہے۔ اس نے مجھے کہلا بھیجا تھا کہ تمہیں قتل کروں گا اور ضرور کروں گا اور مردوں کی طرح آمنے سامنے آ کر قتل کروں گا... لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی طرف سے اسے کوئی موقع دے کر تمہارا کھیل خراب نہیں کروں گا۔"

ہمارے علاقے میں جہاں چوری چھپے قتل ہوتے تھے وہاں یہ رواج بھی عام تھا کہ دشمن قتل کرنے سے پہلے مقتول کو خبردار کر دیا کرتا تھا اور کئی بار ایسے بھی ہوا کہ قتل کا ارادہ کرنے والا خود اس شخص کے ہاتھوں قتل ہو گیا جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ رزاق نے اسی رواج کے مطابق اسلم کو کسی کی معرفت پیغام بھیج دیا تھا۔

میں اور راجہ شاہباز خان نے اسلم سے بات کر کے رزاق سے بات کی۔ اُس نے صاف الفاظ میں کہا ــــ "مجھے خون کا بدلہ لینا ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔ اسلم کو قتل کروں گا لیکن ایسے طریقے سے قتل کروں گا جس طرح انہوں نے میرے ماموں کو قتل کیا تھا۔ میں تم دونوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسلم کے ساتھ خواہ مخواہ لڑائی کر کے تمہارا مزہ کرکرا نہیں کروں گا۔ تمہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ تمہارا دوست کس طرح قتل ہوا ہے۔ تمہیں موقعہ کا گواہ نہیں بننا پڑے گا۔"

ہو سکتا ہے ہمارے شہری بہن بھائی رزاق کو غیر معمولی طور پر دلیر آدمی سمجھیں اور شاید

انہیں یقین ہی نہ آئے کہ اس نے اس قسم کی بات کہی ہوگی۔ لگتا بھی عجیب ہے کہ ایک آدمی قتل جیسے جرم سے پہلے دوسروں کو بتا دے کہ وہ یہ جرم کرنے لگا ہے۔ لیکن یہ ایک رواج تھا کہ قتل کا بدلہ قتل سے نہ لینے والے کو بزدل اور بے غیرت سمجھا جاتا تھا۔ قتل سے پہلے قتل کی دھمکیاں دینے رہنا ضروری ہوتا تھا۔ ہمارے علاقے میں آج بھی یہ رواج موجود ہے لیکن پہلے کی نسبت کم ہو گیا ہے۔ پھر بھی آپ ایسی خبریں پڑھتے رہتے ہیں کہ پورے خاندان کو قتل کر دیا گیا۔ میں جس دَور کی بات کر رہا ہوں اُس وقت اس رواج کی گرفت بہت ہی شدید تھی۔ لہٰذا رزاق اسلم کو قتل کرنے پر مجبور تھا۔ بہرحال یہ بہت ہی افسوسناک بات تھی کہ دو گبھرو اور خوبرو نوجوان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔

اسلم کی ماں مجھے کئی بار کہہ چکی تھی کہ اسلم تمہارے ساتھ شکار پر جایا کرتا ہے، اسے اکیلے اِدھر اُدھر نہ ہونے دینا۔ ایک بھائی اور ایک بیٹا گنوا بیٹھی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بیٹا بھی دشمنوں کے ہاتھ چڑھ جائے ــــ میں اسے تسلیاں دیتا رہتا تھا کہ ہماری موجودگی میں کوئی کسی کے ہاتھوں قتل نہیں ہو سکتا۔

اب ہم شکار کے لیے جا رہے تھے۔ رزاق ساتھ تھا اور اُس نے اپنی نیت کا اظہار کر دیا تھا۔ ہم اس شکاری مہم پر کچھ دُور نکل جانے کا پروگرام بنا کر چلے تھے۔ سردیوں کا موسم گزر گیا تھا۔ بہار کی رُت تھی۔ دھوپ میں بڑی پیاری تپش تھی۔ جسموں میں نئی جان اور نیا خون آ گیا تھا۔ شکار کا یہی تو موسم ہوتا تھا ــــ آپ راولپنڈی سے جہلم جائیں تو جہلم پہنچنے سے پہلے آپ پہاڑیوں کے علاقے میں سے گزرتے ہیں جہاں سڑک اور ریل گاڑی بل کھاتی ہوئی گذرتی ہے۔ بڑے بڑے خطرناک موڑ آتے ہیں۔ پہاڑیاں کاٹ کر سڑک اور ریل گزرتی ہے۔ یہ علاقہ وسیع اور عریض ہے۔ اونچی پہاڑیاں، گہرے کھڈ

اور کھائیاں ہیں۔ آج کل یہ علاقہ محفوظ ہے۔ دن رات ریل گاڑیاں اور سڑک سے ٹریفک گزرتی ہے۔ بسوں اور ٹرکوں کی قطاریں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ آپ رات کے وقت بھی گزریں تو کوئی خطرہ نہیں۔ پہاڑیوں کے اندر کے علاقے میں بھی سڑکیں اور پکے راستے بن گئے ہیں۔

میں جس دور کی بات کر رہا ہوں، اُس وقت بھی یہاں سے ریل اور سڑک گزرتی تھی لیکن سورج غروب ہونے کے بعد سڑک پر کوئی گاڑی نظر نہیں آتی تھی۔ سڑک ویران ہو جاتی تھی۔ دن کے وقت بھی کوئی فوجی گاڑی ہی نظر آتی تھی۔ اُس دور میں بسیں بھی نہیں تھیں۔ کاریں اور ٹرک بھی نہیں تھے۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں اور رہزنوں کا مسکن ہوتا تھا۔ آپ نے "حکایت" میں شاہمدو ڈاکو کی کہانی پڑھی ہوگی۔ وہ اسی علاقے کا ڈاکو تھا۔ یہ ڈاکو اور رہزن انسانی درندے تھے جو دن کے وقت بھی راہ جاتے لوگوں کو لوٹ لیتے تھے۔

اس پہاڑی علاقے میں بھیڑیے عام ہوتے تھے۔ بعض لوگوں نے وہاں شیروں کا ایک جوڑا بھی دیکھا تھا۔ یہ ببر شیر یا دھاری دار شیر نہیں تھے بلکہ جنگلی بلی اور شیر کے بین بین کوئی نسل تھی۔ جسم کُتے جتنا اور شکل شیر جیسی ہوتی تھی۔ یہ درندہ خونخواری میں شیر سے کم نہیں تھا۔ درختوں پر چڑھ جاتا تھا۔ اگر میں کم عقلی کی وجہ سے غلطی نہیں کر رہا تو شیر کی یہ قسم افریقہ کے بعض حصوں میں اور امریکہ کے کچھ علاقوں میں افراط سے پائی جاتی ہے۔ اسے انگریزی زبان میں جاگر کہتے ہیں۔

ان پہاڑی جنگلوں میں ہرن، ہڑیال اور جنگلی دنبے بھی کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ لیکن دنبے اور دوسرے جنگلی جانور بڑے جنگلوں کی طرح زیادہ نہیں تھے۔ اُس دور میں یہ علاقہ گھنا جنگل ہوتا تھا۔ پھر انسانوں نے درخت کاٹ کاٹ کر اس علاقے کو

ننگا کرنا شروع کر دیا۔ اور جب زمانہ ترقی کرتا گیا، موٹریں اور بسیں چل پڑیں تو علاقہ محفوظ ہوتا گیا۔ اس سے لوگوں نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ جنگل کا جنگل کاٹ کر لے گئے۔ انگریز یا بڑے بڑے دیسی صاحب وہاں بندوقوں سے شکار کھیلنے جایا کرتے تھے۔ اس طرح انسانوں نے زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جنگل کو ویران کر ڈالا۔ اور اب تو یہ علاقہ تیزی سے آباد ہوتا چلا جا رہا ہے۔

میں جس دور کی بات کر رہا ہوں اُس وقت اس علاقے میں بہت خطرے تھے۔ لیکن ہماری اُٹھتی جوانی ہمیں ہر خطرے میں کود جانے پر اُکساتی تھی۔ اُس روز جب رزاق بھی ہمارے ساتھ شکار پر جانے کا تھا، ہم نے اس پہاڑی علاقے میں شکار کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ علاقہ ہمارے گاؤں سے آٹھ نو میل دُور سے شروع ہوتا ہے۔ ہم نے گاؤں میں کسی کو بھی نہ بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اگر کسی بزرگ کو پتہ چل جاتا تو وہ ہمیں روک لیتا۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ اس علاقے میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ ایک روایت یہ بھی مشہور تھی کہ یہاں سے ایک بارات گزر رہی تھی۔ چلتے چلتے بارات کا ہر فرد پتھر بن گیا اور یہ پتھر ابھی تک وہاں کھڑے ہیں۔ چونکہ اس علاقے کو اندر سے کسی نے کبھی جا کر دیکھا نہیں تھا کہ کیسا ہے اس لیے یہ لوگوں کے لیے پُراسرار بنا ہُوا تھا۔ ہم دراصل ان پہاڑوں کے اندر چھپی ہوئی دنیا سے خوفزدہ تھے لیکن ہماری مردانگی بیدار ہو گئی تھی اور اب ہم ہر اُس جگہ اور ہر اُس چیز کو قریب جا کر دیکھنا چاہتے تھے جس سے ہم بچپن میں ڈرا کرتے تھے۔ خوف پر قابو پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جس چیز سے خوف آئے اس کا سامنا کرو۔

ہم سولہ لڑکے تھے جن میں سب سے چھوٹے کی عمر سولہ سال تھی اور سب سے بڑا

بیس سال کا تھا۔ ہمارے ساتھ چودہ کتے تھے جن میں ایک سے ایک خونخوار تھا۔ ہمارے ساتھ دو تین کلہاڑیاں، چار پانچ لاٹھیاں، شاہ بلوط کے کئی ایک موٹے ڈنڈے اور چاقو بھی تھے۔ ہم بڑے بڑے خطروں کا مقابلہ کر سکتے تھے ـــــ ہم ڈیڑھ دو میل دور گئے ہوں گے کہ ایک لڑکے نے مجھے رازداری سے کہا کہ اسلم کو نظر میں رکھنا۔ میں نے پوچھا کہ کوئی خاص بات ہے؟ اُس نے جواب دیا ـــ "خاص بات ہے تب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ اسے اکیلا نہ چھوڑنا"۔

یہ اطلاع میرے لیے کوئی نئی نہیں تھی۔ اس لڑکے کو معلوم نہیں تھا کہ میں رزاق کے ساتھ بات کر چکا ہوں اور وہ مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا ہے۔ ہم ایسے علاقے میں جا رہے تھے جہاں ہم سب کا ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو جانا ضروری تھا۔ میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ رزاق کے پاس ہتھیار کیا ہے اسے کہا کہ یار، سنا ہے ان پہاڑیوں میں چیتے اور شیر بھی ہوتے ہیں۔ تمہارے پاس کوئی چھری چاقو ہے؟ ـــ اُس نے ناف میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس کے ہاتھ میں خنجر جیسا بڑا چاقو تھا۔ مجھے دکھا کر کہنے لگا ـــ "اس کے مقابلے میں تلوار کیا کرے گی" ـــ میں اس سے یہ چاقو لے کر اپنے قبضے میں کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے چاقو دیکھنے کے بہانے لے لیا اور اسے کہا کہ یہ میرے پاس رہنے دو۔ مجھے کتوں کے ساتھ بہت دور آگے تک جانا پڑتا ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

اُس نے جھپٹا مار کر چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا اور ناف میں اڑس کر عجیب سے انداز سے مسکرایا کہنے لگا ـــ "آج ہی تو مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اپنا کام کر لوں تو لے لینا"۔

مجھ میں بھی جوانی کا خون تھا اور یہ خون تازہ تھا۔ میں ان سب سے بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ میری برادری میں آدمیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ کسی گاؤں پر حملہ کر دیتے تو اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ یہ تو خاندانی شرافت تھی جو مجھے اونچا نہیں بولنے دیتی تھی ورنہ مجھے ڈر تو کسی کا نہیں تھا۔ میرے والد صاحب مرحوم ہمیں یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ دوسروں کی عزت کرنے سے اپنی عزت ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اصل مرد وہ ہے جو غصہ پی جاتے اور زیادتی کرنے والے کو بخش دے۔ والد صاحب کو اللہ جنت عطا فرمائے، ان کا رعب دُور دُور تک تھا اور یہ شرافت کا رعب تھا۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ میرے والد صاحب مرحوم کی شرافت ان کی کمزوری نہیں۔ وہ ڈانگ مار بھی تھے۔ اور لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ نوبت کبھی مقدمہ بازی تک آ گئی تو میرے والد صاحب مرحوم کو دوسروں کی طرح زمینیں ہندوؤں کے پاس گروی رکھنے کی ضرورت نہیں۔ گھر میں دانے بھی تھے۔ پیسے بھی تھے اور زمین بے شمار تھی۔ لیکن اللہ کا کرم تھا کہ میں نے کبھی تکبر نہیں کیا تھا۔

اس سے پہلے میں نے رزاق کو شرافت سے اور دوستانہ طریقے سے سمجھایا تھا اور اسے بار بار کہا تھا کہ ہم نوجوانوں کو آپس کی دشمنی زیب نہیں دیتی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے کمزور اور اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھ بیٹھا تھا۔ اب جب اس نے میرے ہاتھ سے اپنا چاقو چھین کر اور عجیب سے طریقے سے مسکرا کر کہا کہ آج ہی تو مجھے اس کی ضرورت ہے تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھے طعنہ دے کر للکارا ہو۔ میرا راجپوتی خون یک لخت جوش میں آ گیا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "سنو رزاقے! تمہارے خاندان میں اتنا دم نہیں ہے کہ میرے خاندان سے دشمنی نبھا سکے۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اور کان کھول کر سن لو.... اسلم کو قتل کرنا تو دُور کی بات ہے، اگر

تم نے اسلم کے جسم کو ہاتھ بھی لگایا تو گاؤں میں تمہاری لاش پہنچے گی۔ اور اگر تم نے ہمیں دھوکہ دے کر اسلم کو الگ تھلگ قتل کر دیا تو تم بھی یہیں قتل ہو گے"۔۔۔ میں نے اسے یہاں تک کہہ دیا۔ "اگر تم نے میرے ساتھ دشمنی شروع کر دی تو گاؤں میں تمہارے خاندان کے صرف مکان رہ جائیں گے۔ آدمی کوئی نظر نہیں آئے گا"۔

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوستی کے لہجے میں کہنے لگا۔ "صابو! تم میرے بھائی ہو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم اسلم کی طرح مجھے بھی اپنا بھائی سمجھتے ہو۔ تم تو مجھے دشمنی اور قتل کی دھمکی دے رہے ہو۔ مجھے صاف کہہ دو کہ تم اسلم کے طرفدار ہو۔ مجھے دشمن سمجھتے ہو۔ تم نے مجھے دشمن کیوں سمجھا ہے"؟

"اس لیے کہ تم نے میرے ہاتھ سے چاقو چھین لیا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔۔۔ "اور تم نے مجھ پر ہنس کر کہا ہے کہ چاقو کی تو مجھے آج ہی ضرورت ہے"۔

اُس نے ناف سے چاقو نکال کر میرے آگے کر دیا اور بولا۔۔۔ "یہ لو چاقو صابو! میں اسلم کو قتل کرنا چاہوں گا تو اس چاقو کے بغیر بھی کر لوں گا۔۔۔ تمہارے ساتھ تو میری کوئی دشمنی نہیں"۔

"اور مجھے تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں"۔ میں نے اسے کہا۔ "میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اسلم نے تم پر ہاتھ اٹھایا تو تم دیکھ لینا کہ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ہاتھوں قتل ہونے سے پہلے وہ تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے۔ جب تک میں اور ہمارے یہ دوست تمہارے ساتھ ہیں اسلم تم پر وار نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ دھوکے میں وار کر بھی گیا تو تمہاری لاش کے ساتھ اُس کی لاش بھی جائے گی۔۔۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں زراقے! گاؤں میں دو لاشیں جائیں گی"۔

اُس نے کچھ اور ہی طریقے سے ہنس کر کہا۔ "صابو! اپنی زبان سے پھر نہ جانا۔ گاؤں میں ایک لاش نہ جائے۔ دو جائیں"۔۔۔ اُس نے ایک بار پھر کہا۔ "یاد رکھنا صابو! دو لاشیں"۔

رزاق نے ایسے کیوں کہا تھا؟ کیا اُسے موت نے اشارہ دے دیا تھا؟۔۔۔ آج پچاس سال گزر گئے ہیں۔ مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ اُس وقت کی ایک ایک بات کانوں میں اس طرح گونج رہی ہے جیسے اب بھی رزاق میرے سامنے کھڑا کہہ رہا ہو۔ "صابو یاد رکھنا۔ دو لاشیں"۔۔۔ اور اس کی ہنسی بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ اس طرح کبھی نہیں ہنسا تھا۔ وہ بڑی زور سے قہقہہ لگایا کرتا تھا مگر اس کی وہ ہنسی اس کی اپنی ہنسی نہیں تھی۔ وہ تو جیسے اسے کوئی اشارہ مل گیا تھا کہ زراقے! تھوڑی سی دیر رہ گئی ہے۔ گاؤں میں دو ہی لاشیں جائیں گی۔ ایک تمہاری دوسری اسلم کی پھر تمہاری دشمنی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

آج دونوں کی قبریں اس طرح اکٹھی ہیں جیسے دو دوست اکٹھے سو رہے ہوں۔ زندہ رہے تو دشمن۔ مر گئے تو دوست بن گئے۔

ہم شکار پر اتنی صبح روانہ ہو گئے تھے کہ ابھی صبح اندھیری تھی۔ میں جب رزاق کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو ہم گاؤں سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ میں اور رزاق رُک گئے تھے اور ہمارے ساتھی آگے چلے گئے تھے۔ کسی نے ہمیں آواز دے کر کہا۔۔۔ "چلو اوئے۔ تیز چلو"۔۔۔ ہم چل پڑے۔ رزاق آگے آگے تھا۔ میں اُس وقت تک پورے جوش میں تھا اور گھوڑے کی طرح چل رہا تھا مگر رزاق سے باتیں کر کے چلا تو میرے دل پر بوجھ پڑ گیا۔ طبیعت میں جوش نہ رہا اور دل میں خوشی نہ رہی۔ مجھے اور میرے

دوستوں کو کتوں کے ساتھ خرگوشوں اور گیدڑوں کے پیچھے دوڑتے، گرتے، زخمی ہوتے اور اٹھتے روحانی خوشی ہوتی تھی مگر اُس روز روح ہی مرگئی اور کوئی غیبی آواز مجھے بار بار کہنے لگی "صابو! ان پہاڑوں میں نہ جانا۔ واپس چلے جاؤ۔ اپنے دوستوں اور اپنے کتوں کو واپس لے جاؤ۔ آگے نہ جانا۔"

میری ایسی حالت کبھی نہیں ہوتی تھی۔ مجھ پر یہ ڈر بھی سوار ہونے لگا کہ ان پہاڑوں کے اندر ضرور چڑیلیں اور شرشرار رہتے ہیں۔ اسی لیے ہم جوں جوں ان کے قریب ہوتے جارہے تھے، میرا دل کسی چیز کے قبضے میں آتا جارہا تھا ــــ رزاق آگے آگے جارہا تھا۔ میرے قدم بوجھل ہورہے تھے۔ اچانک میرا کتا معلوم نہیں کیوں دوڑنے کی کوشش میں میرے اردگرد تیزی سے پھرا۔ میں نے اسے زنجیر ڈال رکھی تھی جس کا دوسرا سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ زنجیر میرے ٹخنوں سے الجھ گئی اور میں منہ کے بل گرا۔ گیکر کا ایک کانٹا میرے دائیں گال میں اتر گیا۔ گرنا تو کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ گرنے سے بھی ہمیں لطف آتا تھا لیکن اُس روز گرا تو میرے دل کی باقی طاقت بھی ختم ہوگئی۔ میرے دل سے آواز نکلی "یا الٰہی خیر کرنا۔ تیرے نام کا آسرا ہے" ــــ گرنے کو میں نے اچھا شگون نہ سمجھا۔ دل میں آئی کہ یہیں سے واپس چلا جاؤں لیکن اس ڈر سے چپ رہا کہ دوست مجھے ڈرپوک کہیں گے۔

مجھے بار بار یہ احساس پریشان کررہا تھا کہ آج اسلم اور رزاق میں سے کوئی ایک قتل ہوجائے گا اور قتل کرنے والا میرے ہاتھوں قتل ہوگا۔ یہ احساس اتنا پکا ہو گیا کہ میں سوچنے لگا کہ دونوں میں سے کون میرے ہاتھوں قتل ہوگا۔ مجھے قتل کرنے سے کوئی ڈر نہ تھا، والد صاحب کی عزت کا بہت خیال تھا۔ میرے دل کی حالت زیادہ

خراب ہونے لگی تو میں تیز تیز چلتا اپنے سب سے زیادہ دانش مند اور سب سے زیادہ گہرے دوست راجہ شاہباز خان سے جاملا اور اسے ساری بات اور اپنے دل کا حال بتادیا۔ وہ بڑا ہی تیز طرار نوجوان تھا۔ اُس نے فوراً جواب دیا ــــ "دونوں میں سے جو بھی گڑبڑ کرے اسے ختم کردو۔ میں اسے کتوں سے پھڑوادوں گا اور گاؤں میں جاکر بتائیں گے کہ اس نے کتوں کو چھیڑا تھا اور کتوں نے اسے مار دیا ہے" ــــ راجہ شاہباز خان کی باتوں سے میرا حوصلہ جاگ اٹھا۔

سورج پہاڑیوں کے پیچھے سے نکل رہا تھا۔ ہم پکی سڑک پر چڑھ گئے اور تھوڑی ہی دور آگے ہم سڑک پر چلتے چلتے پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئے۔ ہم ٹولیوں میں آگے پیچھے جارہے تھے۔ کتوں کی زنجیریں کھول دیں اور وہ اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ ہم سب گپ شپ لگاتے جارہے تھے۔ ہم پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئے تھے۔ سڑک گھوم گھوم کر پہاڑوں میں جارہی تھی۔ دائیں بائیں اونچی پہاڑیاں اور گہری کھائیاں تھیں۔ ایسے علاقے میں ہم پہلی بار آئے تھے۔ ہم اپنے علاقے میں شکار کھیلنے کے عادی تھے۔ ایسی اونچی پہاڑیوں، کھائیوں اور چٹانوں سے ہم بالکل ناواقف تھے۔ یہاں ہوا کی آواز بھی ڈراؤنی تھی۔ ہم گھنے ہی آگے چلتے گئے۔ اور آپس میں اس قسم کی باتیں کرنے لگے کہ ہرن یا ہڑیال یا جنگلی سؤر نظر آیا تو کتے اسے پکڑ لیں گے یا نہیں اور کتے معلوم نہیں اس پتھریلے علاقے میں دوڑ بھی سکیں گے یا نہیں۔ آخر ہم نے خود ہی فیصلہ کیا کہ کتے ہرن یا ہڑیال کو مار لیں گے تو ہم انہیں شکار کھانے نہیں دیں گے کیونکہ ہرن اور ہڑیال حلال ہوتے ہیں۔ ذبح کرکے گاؤں میں اُٹھالے جائیں گے اور سارے گاؤں کی دعوت کریں گے جس میں دوست دشمن سب شامل ہوں گے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا ــــ "ایک جانور سارے گاؤں کے

لیے کافی نہیں ہوگا۔ دو تین ماریں گے۔"

ہم ان خوش فہمیوں سے دل بہلاتے سڑک پر چلتے گئے اور دو میل دور تک چلے گئے۔ یعنی گاؤں سے وہاں تک ہم بارہ تیرہ میل فاصلہ طے کر چکے تھے اور ابھی ہمیں شکار کے پیچھے بھاگنا دوڑنا بھی تھا۔ پھر گاؤں تک واپس بھی جانا تھا۔ ذرا اور آگے گئے تو بڑی پہاڑیوں کے درمیان ہمیں کھلی جگہ نظر آئی۔ ہم سڑک سے ہٹ کر اُس طرف چل پڑے۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ شکار سڑک پر نہیں ملے گا، پہاڑیوں کے اندر ملے گا لیکن ہم ڈرتے تھے کہ پہاڑیوں کے اندر شکار کی جگہ کچھ اعہ نہ مل جائے۔ لیکن ہم دل مضبوط کر کے پہاڑیوں کے درمیان چلے گئے اور اتنی دور آگے چلے گئے جہاں سے سڑک نظر نہیں آتی تھی۔ ہر طرف پہاڑیاں، چٹانیں اور درخت تھے۔ درخت نیچے سے اُوپر تک چلے گئے تھے۔ زیادہ تر درخت پھلاہی کے تھے۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ پھلاہی کو اردو اور انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔ یہ درخت کانٹے دار ہوتے ہیں۔ عام طور پر اونچے نہیں ہوتے۔ وہاں جو درخت تھے وہ بونے بونے تھے۔ ان کی کانٹے دار شاخیں پھیلی ہوئی تھیں جو تیر چلنے نہیں دیتی تھیں۔ پھلاہی کا کانٹا کون سی شکل کا ہوتا ہے۔ نوکیلا سرا سوئی کی طرح باریک اور آگے سے ذرا مڑا ہوا ہوتا ہے اور اتنا مضبوط کہ کھال چیر دیتا ہے۔

ان درختوں میں کہیں کہیں بڑے درخت بھی تھے جن میں کچھ بڑ کے تھے، کچھ پیپل کے اور بیری کے درخت بھی نظر آتے تھے۔ زیادہ خطرناک کیکر کے درخت تھے جن کے خشک کانٹے مگرمچھ ہر طرف بکھرے ہوتے تھے۔ ان کانٹوں کے علاوہ پتھر ہی پتھر تھے جن پر چلا نہیں جاتا تھا۔ ہمیں ڈر یہ تھا کہ کتوں کے پاؤں میں کانٹے اُتر گئے تو کتے بے کار ہو جائیں گے لیکن مہم جوئی اور شکار کے خبط نے سارے ڈر دُور کر دیے اور ہم کانٹے دار

شاخوں اور جھاڑیوں میں راستہ بناتے آگے ہی آگے چلتے گئے۔ ہم بکھر گئے تھے اور ہمارے کتے بے چینی سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ان کی بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ گیدڑوں، خرگوشوں اور بھیڑیوں وغیرہ کی بُو بہت ہی زیادہ تھی۔ کتے جھاڑیوں میں اور بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے شکار کو ڈھونڈ رہے تھے اور بے تابی سے بھونکتے تھے۔

مَیں اور راجہ شاہباز خان اکٹھے رہے۔ ہماری نظر صرف شکار پر نہیں بلکہ اسلم اور رزاق پر بھی تھی۔ ان دونوں کی وجہ سے شکار کا لُطف برباد ہو رہا تھا — آگے ایک چٹان میں غار نظر آیا جس کے دہانے پر ایک درخت کی شاخوں نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ مجھے اتفاقیہ غار کا دہانہ نظر آیا تھا۔ مَیں نے شاخیں ایک طرف کر دیں تو غار کا اندرونی حصہ دکھائی دیا۔ مَیں گھبرا کر پیچھے ہٹ آیا۔ غار میں مجھے ہڈیوں کے دو انسانی پنجر پڑے دکھائی دیے تھے۔ مَیں نے راجہ شاہباز خان کو بلایا۔ ہم دونوں نے درخت کی شاخیں توڑ دیں تاکہ روشنی اندر جا سکے۔ ہم نے اندر جا کر پنجر دیکھے۔ دونوں ایک دوسرے سے دُور دُور پڑے تھے۔ کھوپڑیاں ساتھ ہی پڑی تھیں۔ ایک پنجر خاصا لمبا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ مرد کا ہے۔ دوسرا چھوٹا تھا۔ اس کے قریب چاندی کے بندے پڑے دیکھے جو اُس زمانے میں عورتیں کانوں میں ڈالا کرتی تھیں۔ اُن بندوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ عورت ہے۔

غار بہت کھلا تو نہیں تھا لیکن تنگ بھی نہیں تھا۔ اس میں کھڑے ہو کر چلا پھرا جا سکتا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مردانہ اور زنانہ جوتوں کا ایک ایک جوڑا نظر آیا۔ دونوں کا چمڑا لکڑی کی طرح سُوکھ گیا تھا۔ پھر ایک کلہاڑی پڑی ملی جو ہم نے اٹھائی نہیں۔ دونوں کھوپڑیوں میں دانت محفوظ تھے۔ الگ ہو کر گرے نہیں تھے۔ دانتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ جوانی میں مرے یا شاید قتل ہوئے تھے۔ وہ قتل ہی ہوئے ہوں گے۔ مَیں اور راجہ

شاہباز خان سوچنے لگے کہ انہیں کس نے قتل کیا ہوگا۔ یہ میاں بیوی بھی ہو سکتے تھے اور بہن بھائی بھی۔ شاید ادھر سے گزرتے رہزنوں کے ہاتھوں مارے گئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عورت (یا جوان لڑکی) اس آدمی کے ساتھ بھاگ آئی ہو اور اس کے لواحقین نے یہاں آلیا ہو اور دونوں کو قتل کر کے لاشیں غار میں پھینک دی ہوں۔ بہرحال یہ ایک واردات تھی۔

ہم غار میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ شاید ان کے کپڑوں کا کوئی ٹکڑا کہیں پڑا مل جائے لیکن ایک دھاگہ بھی نظر نہ آیا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دس بارہ سال سے یہاں پڑے ہیں۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا ہوگا۔ ان کے کپڑے گل سڑ گئے یا کیڑے مکوڑے کھا گئے۔

اچانک میرا کتا بھونکا۔ فوراً ہی راجہ شاہباز خان کا کتا غرّایا۔ دونوں کتے غار سے باہر تھے۔ ہمیں ان کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں اور اپنے ساتھیوں کی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ کسی شکار کے پیچھے دوڑ رہے ہوں۔ ہم دونوں جلدی سے غار سے باہر آ گئے۔ میرے دل پر پہلے ہی بوجھ تھا۔ ان دو انسانی پنجروں کو دیکھ کر دل پر گھبراہٹ زیادہ ہو گئی۔ اب تو مجھے یقین ہونے لگا کہ ہمارے آج کے شکار کا انجام اچھا نہیں ہوگا اور کچھ ہونے والا ہے — باہر آ کر ہم نے دیکھا کہ ہمارے کتے دوڑے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ہمارے ساتھی تھے۔ ہم دونوں بھی دوڑ پڑے اور اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔

ہم نے دُور آگے دیکھا۔ پہلے تو کچھ نظر نہ آیا۔ ذرا دیر بعد ایک لومڑی بھاگتی نظر آئی۔ لومڑی رُک گئی۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور کتوں کی فوج کو اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر پھر دوڑ پڑی۔ اسلم کا تازی کتا ہوا سے باتیں کرتا دوڑا جا رہا تھا اور دوسرے کتے بھونکتے غرّاتے پیچھے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ ہمارے لیے تیز دوڑنا مشکل تھا۔ پتھر زیادہ تھے اور درخت بھی

تھے جن کی کانٹے دار شاخیں بار بار راستے میں آتی تھیں۔ دائیں بائیں چٹانیں تھیں۔ آگے علاقہ کھلا ہوتا جا رہا تھا۔ کھڈ بھی تھے۔ لومڑی بھاگتے بھاگتے غائب ہو جاتی جیسے زمین نے نگل لیا ہو۔ پھر زمین سے اُبھر آتی۔ اچانک ایک کی بجائے تین لومڑیاں نظر آنے لگیں۔ شاید باقی دو راستے میں کہیں کھڑی تھیں جو ایک لومڑی کو بھاگتے دیکھ کر اُس کے ساتھ بھاگ اُٹھیں۔

کتے تو کھڈوں اور نشیب و فراز سے کودتے پھلانگتے دُور نکل گئے۔ ہم بہت پیچھے رہ گئے۔ ہمارے کتے شکار کو اتنی دُور تک بھاگنے کی مہلت نہیں دیا کرتے تھے لیکن ایسے پتھریلے علاقے میں دوڑنے کے وہ عادی نہیں تھے۔ لومڑی اسی علاقے کی تھی۔ اُس کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ میں نے دُور سے دیکھا کہ لومڑیاں دائیں طرف کو مڑ گئیں اور ایک سیدھی دوڑتی گئی۔ ہمارے کتے بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے پھر ہمارے ساتھی بھی بکھر گئے۔ کچھ دائیں طرف کی چٹانوں میں ایک کھلے راستے کی طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں، راجہ شاہباز خان اور دو اور لڑکے آگے کو ہی دوڑتے گئے۔ آگے گئے تو عجیب و غریب علاقہ آ گیا۔ زمین سے چھوٹی چھوٹی چٹانوں کی نوکیں اُبھری ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان گہرے کھڈ تھے۔ کچھ چٹانیں ذرا اونچی تھیں۔ یہ بھول بھلیاں سی تھیں جو بہت ہی وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہمارے کتے انہی میں کہیں غائب ہو گئے تھے۔ ان کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دُور دُور ہو گئے ہیں۔ ہمیں اب لومڑی کی ضرورت نہیں تھی۔ اب غم کتوں کا لگ گیا تھا۔ انہیں روکنا اور واپس لانا تھا۔

یہ علاقہ ایسا تھا کہ دوڑنا ناممکن تھا اور چلنا بھی دشوار تھا اور اس علاقے کے خدوخال ایسے تھے کہ اگر اکیلا آدمی اُدھر سے گزرے تو خوفزدہ ہو جائے — میں اور راجہ شاہباز خان

اس عجیب و غریب زمین پر چلتے چلتے اتنے تھک گئے جتنا بیس میل چل کر بھی نہ تھکتے۔ ہم شاید دو یا زیادہ سے زیادہ تین فرلانگ چلے ہوں گے۔ آگے ایسی جگہ آگئی جہاں چلاہی اور گیگری کے بڑے بڑے درختوں کی بہتات تھی۔ ان کے نیچے زمین چلنے کے قابل نہیں تھی۔ کتوں کی اور کسی نہ کسی ساتھی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن ایسے جیسے وہ گہرے کنوئیں میں بول رہے ہوں۔

ہمارے قریب ایک اونچی چٹان تھی۔ ہم اس پر چڑھنے لگے۔ ہم نے سوچا کہ بلندی سے ہمیں کتے اور اپنے ساتھی نظر آجائیں گے۔ ہم دونوں اپنی پارٹی سے بچھڑ گئے تھے اور ہم دونوں کے کتے بھی ہم سے جدا ہو گئے تھے۔ ہم چٹان پر چڑھتے گئے۔ یہ چٹان نہیں بلکہ اچھی خاصی پہاڑی تھی۔ نیچے سے اتنی اونچی نظر نہیں آتی تھی مگر اس پر چڑھنے لگے تو ایسے لگتا تھا جیسے یہ اونچی ہی اونچی ہوتی چلی جا رہی ہو۔ ہم جوں جوں اوپر چڑھتے گئے ہمیں بونے درختوں کی چوٹیاں نظر آتی گئیں۔ ان درختوں نے چھتریوں کی طرح نیچے کی دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ ان میں سے چھوٹی چٹانوں کی چوٹیاں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہم اور اوپر چڑھ گئے اور پہاڑی کی چوٹی پر جا چڑھے۔ اوپر تنگ اور لمبا سا میدان تھا یا یوں سمجھئے کہ چوٹی چپٹی اور ہموار تھی۔ دوسری طرف دیکھا تو سرخی مائل رنگ کے ٹیلے نظر آئے اور ان کے ارد گرد اونچی اونچی چٹانیں۔ اُدھر بڑے بڑے درخت بھی تھے۔ جس پہاڑی پر ہم چڑھے تھے اس کی ڈھلان پر بھی بڑے بڑے درخت تھے۔

ہم چوٹی پر آگے کو چلتے گئے۔ آگے ایک درخت کے نیچے رزاق کو کھڑے دیکھا۔ ہم اسے دیکھ کر حیران نہیں ہوتے نہ یہ سوچا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ البتہ ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیں وہاں دیکھ کر حیران ہو گیا ہے

اگھبرا گیا ہے۔ کہنے لگا کہ نیچے نہ کوئی لڑکا نظر آتا تھا نہ کوئی کتا۔ میں اکیلا رہ گیا تھا۔ دوڑ کر اوپر چڑھ آیا۔ یہاں سے نیچے دیکھتا ہوں تو بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بھی اسی امید پر اوپر آئے ہیں کہ شاید یہاں سے کوئی لڑکا نیچے گھومتا پھرتا نظر آجائے۔

میں نے اسے کہا "چلو، جس طرح ہم تینوں اکٹھے ہو گئے ہیں، دوسرے بھی مل جائیں گے۔ آؤ آگے چلیں" ــــ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے آگے لے جانے لگا لیکن اس نے پیچھے کو اشارہ کر کے کہا ــــ "تم دونوں اُدھر چلے جاؤ۔ میں ادھر جاتا ہوں۔ جہاں جہاں کوئی لڑکا نظر آئے اسے اکٹھا کر لو" ــــ راجہ شاہباز خان نے اسے کہا ــــ "نہیں یار، اکٹھے رہیں تو اچھا ہے.... کہاں آن پھنسے یار۔ آئندہ ادھر نہیں آئیں گے۔ اپنا علاقہ اچھا ہے۔ یہ تو جنوں اور پریوں والا کوہ قاف ہے"۔

رزاق ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ ہمیں اُدھر ہی واپس جانے کو کہہ رہا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ اس کے زور دینے پر مجھے شک ہونے لگا کہ کوئی خاص بات ہے۔ مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اسلم اکیلا اُدھر گیا ہو جدھر رزاق اکیلا جانا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا ــــ "رزاق، تم نے اسلم کو اُدھر جاتے دیکھا ہے"؟ ــــ یہ سوال اس کے لئے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ اس نے ہکلا کر کہا ــــ "نہ۔ نہیں.... وہ اُدھر نہیں گیا" ــــ پھر کہنے لگا ــــ "تم واپس کیوں نہیں جاتے"؟ ــــ اور وہ اچانک غصہ میں آگیا۔ بولا ــــ "دونوں میرے پیچھے آتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اسلم کے پیچھے آیا ہوں"۔

راجہ شاہباز خان ہنس پڑا۔ مجھے ذرا سا غصہ آگیا تھا لیکن راجہ شاہباز خان کی ہنسی سے غصہ دُور ہو گیا۔ اُس نے رزاق کو بازو سے پکڑا اور کہنے لگا ــــ "یار تم ناراض ہی رہتے ہو۔ آؤ آگے چلیں"۔

وہ بددلی سے ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم پہاڑی کے اوپر اوپر جا رہے تھے اور ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ہمیں کہیں نیچے سے بھونکنے اور غرّانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم آگے کو دوڑ پڑے۔ ذرا دیر بعد ہمیں لمبی پکار سنائی دی ــــ "او... ہو.... او..... ہو" ــــ ہم رُک گئے۔ مَیں نے راجہ شاہباز خان کی طرف اور اُس نے میری طرف دیکھا۔ یہ پکار ایک بار پھر سنائی دی۔ راجہ شاہباز خان نے کہا ــــ "آواز اسلم کی ہے" ــــ مَیں نے بھی کہا ــــ "اسلم کی ہی معلوم ہوتی ہے" ــــ مَیں نے رزاق کو دیکھا۔ وہ خاموش تھا۔ مَیں نے اس سے پوچھا ــــ "یہ اسلم کی ہی آواز ہے نا؟" ــــ اس نے جھنجھلا کر جواب دیا ــــ "مجھے کیا پتہ کون ہے" ــــ اور اس نے سر کو اس طرح جھٹکا جیسے اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہو ــــ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آواز اسلم کی ہے۔ وہ یقیناً اُدھر اکیلا چلا گیا ہو گا اور رزاق نے اسے دیکھ لیا ہو گا۔ اسی لیے رزاق ہمیں بار بار کہتا تھا کہ مَیں اور راجہ شاہباز خان دوسری طرف چلے جائیں۔ وہ اسلم پر وار کرنا چاہتا تھا۔

اتنے میں اسلم کی پکار پھر سنائی دی ــــ "صابو او تے" ــــ وہ اب مجھے پکار رہا تھا۔ اس کے ساتھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہم تیزی سے آوازوں کی طرف چل پڑے لیکن تیز نہیں چلا جاتا تھا۔ آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ دُور نیچے سے آ رہی ہیں۔ بلکہ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آوازیں نہیں بلکہ آوازوں کی گونج ہے۔ ہم تینوں آگے بھی جا رہے تھے اور پہاڑی سے اُتر بھی رہے تھے۔ ہم جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے اسلم کی پکار بلند ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی سخت گھبرائی ہوئی پکار سنائی دی ــــ "پہنچیا صابو" ــــ اور پھر اس نے کئی ایک لڑکوں کو باری باری پکارا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ راجہ شاہباز خان نے بڑی زور سے کہا ــــ

"پہنچے بھائی اوتے، پہنچے، اچھو اوتے۔ ہم آ رہے ہیں" ــــ ہم پوری تیزی سے آگے اور نیچے جانے لگے۔ رزاق ہمارے پیچھے تھا۔

اب بھونکنے کی آواز آئی تو راجہ شاہباز خان کے منہ سے بے اختیار نکلا ــــ "او خدایا" میرا دل دہل گیا کیونکہ بھونکنے کی یہ آواز کسی کُتے کی نہیں بلکہ بھیڑیئے کی تھی اور اس کے غرّانے کی آواز بتاتی تھی کہ وہ کسی پر حملہ کر رہا ہے یا کتوں سے لڑ رہا ہے۔ ہمیں پہاڑی چلنے نہیں دے رہی تھی ورنہ ہم اُڑ کر پہنچتے۔ راجہ شاہباز خان آگے نکل گیا اور اچانک رُک گیا۔ مَیں اس تک پہنچا تو مَیں بھی رُک گیا۔ یہاں پہاڑی ختم ہو گئی تھی۔ ہم دیلڑ کے اوپر یا یوں سمجھیے کہ کسی مکان کی منڈیر پر کھڑے تھے۔ بلندی بہت زیادہ نہیں تھی۔ ایک سو یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو فٹ ہو گی۔ نیچے دو کنال جتنا میدان تھا جہاں چند ایک درخت تھے اور یہ درخت چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی۔ ان میں ایک درخت بڑ کا تھا۔ نیچے دو کنال کا جو میدان نظر آ رہا تھا وہ چٹانوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہ بڑی ہی خوفناک اور پُراسرار جگہ تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے کبھی کسی انسان کا گزر نہیں ہوا۔

اس میدان میں ہم نے جو منظر دیکھا اس سے ہمارے دم خشک ہو گئے۔ اکیلا اسلم چار بھیڑیوں کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک کتا تھا جو بھیڑیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ چاروں بھیڑیئے چکر میں دوڑ رہے تھے اور غرّا غرّا کر اسلم کو دیکھ رہے تھے۔ اسلم کے ہاتھ میں اپنے کتے کی زنجیر تھی۔ اس کا اپنا کتا تازی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو کتا اس کے ساتھ تھا وہ ہمارے ایک ساتھی ہاشم کابل ٹیریر تھا۔ وہ اسلم کے اردگرد دوڑ رہا تھا جیسے اسے بھیڑیوں سے بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بجلی کی تیزی سے دوڑ کر ایک بھیڑیئے پر حملہ کرتا تو پیچھے سے دوسرا بھیڑیا اس پر ٹوٹ پڑتا۔ اسلم کا ہتھیار یہی ایک

زنجیر تھی جو اس نے دوہری کر کے پکڑ رکھی تھی۔ وہ زنجیر کو گھما رہا تھا۔ جب کتا کسی بھیڑیے پر حملہ کرتا تو اسلم زناٹے سے زنجیر گھما کر کسی دوسرے بھیڑیے کو مارنے کی کوشش کرتا تھا۔ بھیڑیے دُور بھاگ کر پھر اس کے گرد دوڑنے لگتے۔

ہم نے یہ منظر زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سیکنڈ دیکھا تو پھر اسلم تک پہنچنے کا راستہ دیکھنے لگے۔ فوراً پہنچنے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ قریبی راستہ ایک ہی تھا کہ ہم ڈیڑھ سو فٹ اونچی دیوار سے نیچے کود جاتے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا کہ ہماری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ بائیں طرف بڑی خطرناک ڈھلان تھی جس سے ہم بیٹھ کر یا رینگ کر اُتر سکتے تھے مگر وہ نیچے ایسی جگہ جا کر ختم ہوتی تھی جہاں سے ایک چٹان شروع ہوتی تھی۔ یہ چٹان اس میدان کا راستہ روکے ہوئے تھی جہاں اسلم بھیڑیوں کے نرغے میں آیا ہوا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے اس چٹان پر چڑھنا اور دوسری طرف اُترنا تھا۔ اس راستے سے اتنا وقت لگ جانا کہ بھیڑیے اسلم کا قصہ پاک کر چکے ہوتے۔ دائیں طرف اسی پہاڑی کی چوٹی تھی جس پر ہم کھڑے تھے۔ اوپر جا کر آگے جانا اور بہت دُور جا کر اُترنا بڑا ہی مشکل اور وقت طلب تھا۔ پھر بھی ہم وہاں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ہمارا عزیز دوست درندوں کے گھیرے میں تھا۔ اگر ہاشم کابلی ٹیڑہ اس کے ساتھ نہ ہوتا تو اب تک بھیڑیے اس کی ایک بوٹی بھی نہ رہنے دیتے۔

میں نے چلا کر کہا ــــ "اچھو اجم کے۔ دل نہ چھوڑنا" ــــ راجہ شاہباز خان بائیں طرف والی ڈھلان سے اُترنے لگا۔ وہ بہت تیز دوڑا۔ وہ اٹھا اور پھر دوڑ کر اُترنے لگا۔ میں نے بڑے بڑے دو پتھر اُٹھائے اور ایک ایک کر کے بھیڑیوں پر پھینکے۔ پہلا پتھر ایک بھیڑیے کے قریب گرا لیکن کوئی بھی بھیڑیا نہ ڈرا۔ دوسرا پتھر ایسی جگہ گرا جہاں اسلم زنجیر گھماتا

پہنچ گیا تھا۔ صرف ایک سیکنڈ کا فرق رہ گیا تھا۔ اگر اسلم ایک سیکنڈ پہلے وہاں پہنچ جاتا تو پتھر اس کے سر پر لگتا۔ اس نے بلند آواز سے کہا ــــ "پتھر نہ مارو۔ نیچے آؤ" ــــ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ ہوشیار ہو گیا تھا۔

میں نے رزاق کو دیکھا۔ وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے اسلم اور بھیڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اُس کے چہرے سے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ اسلم کو اس مصیبت میں دیکھ کر اسے افسوس ہے۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے سوچا کہ وہ بہت خوش ہے کہ وہ قتل کرنے سے بچ گیا اور بھیڑیے اسلم کا کام تمام کر دیں گے۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ بھیڑیے اس کے دشمن کو چیر پھاڑ دیں۔ اس کی امید پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اسلم کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی ــــ بھیڑیوں کی غراہٹ اتنی زور سے سنائی دی کہ میں نے گھبرا کر اُدھر دیکھا۔ کتا ایک بھیڑیے کے ساتھ الجھ گیا تھا۔ یا شاید اس بھیڑیے نے کتے کو اپنے ساتھ الجھا لیا تھا۔ اب دونوں میں سے کسی ایک کو مرنا تھا۔ زیادہ یقین یہی تھا کہ کتا مرے گا کیونکہ بھیڑیا خونخوار ہوتا ہے۔ باقی تین بھیڑیے اسلم کے قریب ہو گئے تھے۔ وہ اس کے گرد غرا غرا کر دوڑتے اور اس کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ اسلم زنجیر گھماتا ہوا تیزی سے گھومتا جا رہا تھا۔ اُس نے بھیڑیوں پر نظر رکھتے ہوئے بائیں ہاتھ میں ایک پتھر اُٹھا لیا۔

سامنے سے ایک بھیڑیے نے اُچھل کر اس پر حملہ کیا۔ اسلم کی توجہ اُدھر ہی تھی۔ اگر آج کا کوئی نوجوان ہوتا تو اس کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی۔ اسلم نے پیچھے ہٹ کر زنجیر گھمائی جو بھیڑیے کے منہ پر لگی۔ بھیڑیا بڑی زور سے چیخا اور ایک طرف جا پڑا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو بھاگ جاتا لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ بہت دلیر تھا۔ وہ لڑھکا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پیچھے سے ایک بھیڑیے نے اسلم کی پنڈلی دانتوں میں دبا لی۔ اسلم نے زنجیر

گھما کر اسے بھی ماری اور اس کے ہاتھ میں جو پتھر تھا وہ اس کے سر پر مارا۔ یہ بھیڑیا بھی اگلا ہو گیا لیکن دوسرے دو بھیڑیے، ایک دائیں اور ایک بائیں سے اس پر حملہ کرنے کے لیے پر تولنے لگے۔ جو چوتھا بھیڑیا کتے سے لڑ رہا تھا، اس نے کتے کو بے بس کر دیا تھا وہ آخر درندہ تھا۔

میں نے اُس طرف نیچے دیکھا جدھر راجہ شاہباز خان اُتر گیا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا چٹان پر چڑھ رہا تھا۔ وہ اسلم کو بچانے کے لیے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا۔ میں اپنی پریشانی اور مجبوری کو بیان نہیں کر سکتا۔ ہم تو ایک دوسرے کے لیے جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے مگر یہاں ایسی مجبوری کہ میں پہاڑی سے کود کر جان دے سکتا تھا جو اسلم کے کسی کام نہ آ سکتی۔

اچانک رزاق کی گرجدار آواز سنائی دی ــــ "صالو، اچھو کو میں بچاؤں گا" ــــ اور اس نے بہت ہی بلند آواز سے کہا ــــ "اچھو، حوصلہ رکھنا۔ میں آ رہا ہوں" ــــ میں نے اسے حیران ہو کر دیکھا لیکن وہ اب وہاں نہیں تھا جہاں کھڑا تھا۔ وہ پیچھے کو دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ مڑ گیا اور پیچھے مڑا۔ وہ بارہ چودہ قدم دُور چلا گیا تھا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ میری طرف دوڑا۔ ہر قدم کے ساتھ اس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ آگے پہاڑی ختم ہو جاتی تھی۔ جب اس کا پاؤں اس جگہ پڑا جہاں پہاڑی ختم ہوتی تھی اور نیچے ڈیڑھ سو فٹ بلند دیوار ہی تھی، تو میرا سانس رُک گیا۔ وہ یقیناً خودکشی کر رہا تھا۔ اس کا آخری قدم اس منڈیر پر پڑا اور وہاں سے وہ پرندے کی طرح ہوا میں چلا گیا جیسے نیچے دریا بہہ رہا ہو اور وہ اس میں ڈائیو لگا رہا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ نیچے کے میدان میں ایک طرف بڑا کا درخت تھا جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ اس کے

کچھ ٹہن عمودی چٹان سے ذرا ہی دُور تھے۔ رزاق پرندے کی طرح ہوا میں جا رہا تھا۔ اُس نے بازو پھیلا رکھے تھے پھر اس نے بازو آگے کو کیے اور وہ نیچے کو بھی جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے بڑی ٹہنیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ٹہنیاں ٹوٹنے لگیں۔ اس نے ایک ٹہن کو پکڑ لیا۔ اس میں شاید دو تین سیکنڈ لگے ہوں گے۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ بلندی زیادہ نہیں تھی۔ وہ ٹہن کو چھوڑ کر کود گیا۔ وہاں بھی تھوڑی سی ڈھلان تھی۔ رزاق لڑھکتا ہوا نیچے گیا۔ میں نے اُسے اٹھتے دیکھا۔ اور اس نے قمیض کے اندر ہاتھ ڈالا اور ناف سے وہ چاقو نکال لیا جو اس نے مجھے دکھایا تھا۔ اس چاقو سے وہ اسلم کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سخت پچھتاوا ہوا کہ میں نے اسے نیچے جانے سے روکا نہیں۔ میں جان گیا کہ وہ اب بھیڑیوں کے دھوکے میں اسلم پر وار کرے گا۔ میں اسلم کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ بائیں کو دیکھا تو راجہ شاہباز خان چٹان پر چڑھ گیا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر کہا کہ جلدی پہنچو، رزاق نیچے چلا گیا ہے۔

میں کیا کرتا؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اچانک یہ خیال آیا کہ وہیں کھڑا دیکھتا رہوں کہ رزاق کیا کرتا ہے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اگر رزاق نے اسلم پر وار کیا تو میں اسے اسی جگہ قتل کر دوں گا اور گاؤں میں دو لاشیں جائیں گی۔ میں اب وہاں کھڑا یہ دیکھنے لگا کہ اسلم اور بھیڑیوں تک راجہ شاہباز خان پہلے پہنچتا ہے یا رزاق۔ راجہ شاہباز خان ابھی بہت دُور تھا۔ رزاق پہنچ گیا تھا۔ لیکن اسلم پر ایک بھیڑیا ٹوٹ پڑا تھا اور اس کا انجام مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بھیڑیے نے پیچھے سے اُچھل کر دونوں نیچے اسلم کے کندھوں پر اور دانت گردن میں گاڑ دیتے تھے۔ میرا خون اس قدر جوش میں آ گیا کہ میں نیچے کود چلا تھا لیکن میں رزاق کو دیکھ کر رُک گیا۔ رزاق اسلم کے پیچھے اور ابھی دُور

ہی تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اُس نے پانچ چھ قدم دُور سے آگے کو چھلانگ لگائی اور چاقو والا بازو اُوپر کر کے بڑی زور سے چاقو اُس بھیڑیئے کی پیٹھ میں اُتار دیا جس نے اسلم کو پیچھے سے پنجوں اور دانتوں میں جکڑ لیا تھا۔ بھیڑیا زور سے چیخا اور اسلم سے الگ ہو گیا۔ رزاق نے بھیڑیئے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اُس کی پیٹھ چیر ڈالی۔ بھیڑیا پیٹھ کے بل ہو کر اُٹھنے لگا تو رزاق نے چاقو اُس کے پیٹ میں مار کر پیٹ چاک کر دیا۔ بھیڑیا پھر بھی اُٹھا اور جب بھاگا تو اُس کی انتڑیاں باہر آ گئیں اور وہ گر پڑا۔

ایک بھیڑیئے نے ابھی تک کُتے کو دبوچ رکھا تھا اور کُتا خوب مقابلہ کر رہا تھا۔ رزاق نے بیٹھے بیٹھے اسلم کی پیٹھ سے لگا لی اور مجھے رزاق کی بڑی بلند آواز سنائی دی — "اچھو، پیٹھ میرے ساتھ لگاتے رکھنا۔ مجھ سے الگ نہ ہونا" — ایک بھیڑیا رزاق کی طرف اُچھل کر گیا۔ رزاق نے بازو کو زور سے گھما کر چاقو کا وار کیا۔ بھیڑیا ایک پہلو کے بل گرا اور تیزی سے اُٹھ کر اُس نے اسلم کی ران میں دانت گاڑ دیئے۔ اس کے نیچے اسلم کی پیٹھ اور پیٹ پر تھے۔ اسلم تیزی سے گھوما۔ بھیڑیا بھی اُس کے ساتھ ہی گھوما اور رزاق سے ٹکرایا۔ رزاق گرتے گرتے بچا اور چاقو بھیڑیئے کی پیٹھ میں اُتار کر ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ بھیڑیئے نے اسلم کو چھوڑ دیا اور بھاگ اُٹھا۔ رزاق گر پڑا۔ اُدھر اسلم پر سامنے سے ایک بھیڑیا آیا۔ اسلم پیچھے ہٹا تو رزاق جو ابھی اُٹھا نہیں تھا، سے ٹکرا کر اس کے اوپر گر پڑا۔ اسلم کے کپڑے خون سے سُرخ ہو گئے تھے۔ رزاق اس کے نیچے سے اُٹھا تو اسلم لڑھک کر ایک طرف کو گر پڑا۔ وہ بہت زیادہ زخمی ہو چکا تھا۔ رزاق اُٹھ چکا تھا۔ بھیڑیا جوان کی طرف آیا تھا وہ ایک طرف آگے کو چلا گیا۔ اسلم نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا۔ رزاق نے اسے کہا — "بیٹھے رہو" — اور وہ اسلم کی

طرف بیٹھ کر کے چاروں طرف گھومنے لگا۔

اب دو بھیڑیئے رہ گئے تھے جن میں ایک زخمی تھا۔ یہ دونوں گھوم گھوم کر آتے تھے۔ رزاق نے اسلم کے ہاتھ سے زنجیر لے کر بائیں ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ اسلم کے گرد گھوم رہا تھا اور زنجیر گھما رہا تھا۔ اس کے زناٹوں سے بھیڑیئے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اگر رزاق نہ ہوتا تو اسلم کو بھیڑیئے چیر پھاڑ چکے ہوتے۔

یہ منظر دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرے پاس موٹا ڈنڈا تھا جس کے ایک سرے پر لوہے کا چھ انچ لمبا خول چڑھا ہوا تھا۔ مَیں نے زمین دوز غاروں میں اس ڈنڈے سے ایک بھیڑیا مارا تھا۔ مَیں نے یہ ڈنڈا پہاڑی سے نیچے پھینک دیا اور رزاق کی طرح بارہ چودہ قدم پیچھے کو دوڑتا گیا۔ مَیں بھی رزاق کی طرح نیچے جانا چاہتا تھا۔ مَیں پیچھے جا کر پیچھے کو مڑا اور تیز دوڑا۔ میری رفتار رزاق سے زیادہ تیز تھی۔ مَیں بہت ہی تیز دوڑا اور آخری قدم جب عمودی ڈھلان کی منڈیر پر پڑا تو مَیں جسم کی تمام تر طاقت صرف کر کے آگے کو اُڑا۔ میرے نیچے ڈیڑھ سَو فُٹ دُور پتھریلی زمین تھی جس پر اگر مَیں گرتا تو جسم کی کوئی ہڈی سلامت نہ رہتی۔ مَیں نے بازو اسی طرح آگے کو کر رکھے تھے جس طرح رزاق نے کیے تھے۔ یہ خودکشی کی چھلانگ تھی۔ مَیں نے ہاتھ آگے کو پھیلائے اور ایک سیکنڈ میں ہاتھوں نے بڑ کے پتوں کو چھو لیا لیکن مَیں کم از کم پچاس فُٹ نیچے آ چکا تھا۔ ایک موٹی شاخ میرے ہاتھوں سے ٹکرائی۔ مَیں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا مگر میں بہت تیزی سے آگے گیا تھا اور مَیں نیچے کو بھی گر رہا تھا اس لیے شاخ پکڑتے ہی میری رفتار یکلخت رُک گئی اور جسم نیچے کو گرا تو کندھوں کو اتنا شدید جھٹکا لگا جیسے بازو کندھوں سے الگ ہو گئے ہوں۔ مجھے

چکر آیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

مَیں سنبھل نہ سکا۔ شاخ مضبوط تھی لیکن میرے ہاتھ جھٹکے سے ڈھیلے پڑ گئے اور شاخ ہاتھوں سے نکل گئی۔ مَیں گرنے لگا۔ ایک ٹہن سے ٹکرایا۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن نہ پکڑ سکا۔ مَیں وہاں سے گرا اور سیدھا پتھروں پر جا پڑا۔ یہ ڈھلان تھی۔ وہاں سے پتھر کی طرح لڑھکتا نیچے چلا گیا۔ اس حالت میں میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ رزاق کس قدر سخت جان ہے۔ مَیں نے اسے جب پہاڑی سے بڑ پر اور بڑ سے زمین پر جاتے دیکھا تو مَیں اسے آسان سا کرتب سمجھا تھا۔ جب یہ کرتب خود کیا تو مَیں نے محسوس کیا کہ ایسے کارنامے کے لیے جسم کی نہیں رُوح اور جذبے کی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ طاقت صرف اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے اندر عزم اور ایثار ہو۔

مَیں اُٹھنے لگا تو دائیں کولہے سے ایسا درد اُٹھا جیسے کسی نے کولہے میں خنجر اُتار دیا ہو۔ مَیں ہاتھوں کے بل ہو کر اُٹھا مگر دائیں ٹانگ نے جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ پھر بھی مَیں نے بائیں ٹانگ آگے کر کے ایک قدم اُٹھایا لیکن گر پڑا۔ ایسے لگا جیسے دائیں ٹانگ کولہے سے الگ ہو گئی ہو۔ ہُوا بھی یہی تھا کہ کولہے کا جوڑ الگ ہو گیا تھا۔ درد اس قدر شدید تھا کہ میرے دانت بجنے لگے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اندھیرا آتا تھا اور گزر جاتا تھا۔ مَیں نے اٹھنے کی کوشش نہ کی۔ مَیں بیٹھے کے بل لیٹ گیا۔

مجھے اپنے قریب بھیڑیوں کی خوفناک آوازیں سنائی دینے لگیں مگر مَیں کچھ دیکھ نہ سکا۔ میری حالت بگڑ رہی تھی۔ آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ تین چار کتے ہیں اور شاید تین چار لڑکے ہیں۔ شاید ہمارے کتے اور لڑکے پہنچ گئے تھے۔ مجھے رزاق کی آواز سنائی دی ــــ وہ اسلم کو بلند آواز سے کہہ رہا تھا ــــ "اچھو گھبرانا نہیں دوست۔ تیرے

پیچھے جان دے دوں گا" ــــ پھر کتوں، بھیڑیوں اور لڑکوں کا شور بڑھ گیا۔ مَیں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ اچانک ایک کتا اور ایک بھیڑیا ایک دوسرے سے گتھم گتھا میرے اوپر آ پڑے اور فوراً ہی میرے اوپر سے ہٹ گئے۔ مَیں نے دیکھا یہ ہمارا نامی گرامی بوہلی تھا جو بھیڑیوں سے زیادہ خونخوار کتا تھا۔ میرے اوپر سے گزر کر بھیڑیا گرا۔ بوہلی نے اس کے اوپر سوار ہو کر اس کی شہ رگ دانتوں میں جکڑ لی۔ بھیڑیا بہت تڑپا لیکن بوہلی نے بھنبھوڑ کر ختم کر دیا۔

مَیں بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہُوا کہ سارے لڑکے آ گئے تھے لیکن وہ ایک جگہ اکٹھے، گول دائرے میں جھکے ہوئے تھے۔ مجھے شاید انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ مَیں نے انہیں پکارا تو سب نے میری طرف دیکھا۔ راجہ شاہباز خان، ہاشم اور نور علی (اللہ ان دونوں کو جنت نصیب کرے) دوڑتے آئے۔ مَیں نے انہیں بتایا کہ مَیں اُٹھ نہیں سکتا۔ انہوں نے سہارا دے کر اُٹھایا۔ میری دائیں ٹانگ بے کار ہو چکی تھی۔ مَیں اپنے دوستوں کے کندھوں پر بازو رکھے ہوئے جسم کو گھسیٹتا لے گیا۔ وہ مجھے اسلم اور رزاق کے پاس لے گئے۔ دونوں اکٹھے زمین پر پڑے تھے۔ خون سے ان کے کپڑے لال ہو گئے تھے۔ وہ تو خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مَیں نے انہیں دیکھ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ سب خاموش تھے۔ راجہ شاہباز خان نے میرے کان میں کہا ــــ "اچھو زندہ نہیں" ــــ میرے دل سے جیسے تیر پار ہو گیا ہو۔ اسلم کی شہ رگ کٹ چکی تھی۔ پیٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ رزاق کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ ان میں حرکت تھی۔ اس کی قمیض تار تار ہو گئی تھی۔ ایک زخم دل کے اوپر تھا۔ گوشت باہر آ گیا تھا۔ اس کا بھی پیٹ چاک ہو گیا تھا۔

مَیں بھیڑیوں اور اپنے دو دوستوں کی جنگ کا آخری منظر نہیں دیکھ سکا تھا۔ راجہ شاہباز خان نے دیکھا تھا۔ اس نے کچھ دن کے بعد مجھے سنایا کہ اسلم گر پڑا تھا اور رزاق

اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ بھیڑیئے گھوم گھوم کر اور غرّا غرّا کر آتے تھے۔ اسلم آخر اُٹھ کھڑا ہُوا مگر گر پڑا۔ رزاق نے اسے کہا ــــ "اچھو، مجھ سے الگ نہ ہونا۔ یہیں بیٹھے رہو، میں سنبھال لوں گا" ــــ مگر ایک بھیڑیئے نے رزاق پر حملہ کر دیا اور دوسرے نے اسلم پر۔ اسلم کی شہ رگ بھیڑیئے کے دانتوں میں آگئی تھی۔ رزاق نے اس حال میں کہ اس کے اپنے جسم کے ساتھ ایک بھیڑیا چپکا ہُوا تھا، اس بھیڑیئے کے پہلو میں چاقو مارا جس نے اسلم کی شہ رگ پکڑی تھی۔ وہ الگ ہو کر بھاگا۔ چاقو رزاق کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بھیڑیئے کے پہلو میں ہی رہا۔ راجہ شاہباز خان کے پاس بھی چاقو تھا۔ وہ چٹان سے اتر کر دوڑتا گیا اور اتنے میں دوسرے لڑکے اور کُتے آگئے۔ بوہلی نے اس بھیڑیئے پر حملہ کیا جو رزاق کے ساتھ چپکا ہُوا تھا۔ بوہلی اور بھیڑیا لڑتے لڑتے میرے اوپر آ گرے اور وہاں سے آگے چلے گئے۔

سارے میدان میں خون ہی خون تھا۔ بل ٹیر بھی مارا جا چکا تھا۔ ہر پتھر پر خون کے چھینٹے تھے۔ ان میں اسلم اور رزاق کا خون تھا، بل ٹیر اور بوہلی کا خون اور بھیڑیوں کا خون تھا۔ بوہلی بھی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے پہلو اور سر سے کھال اتر گئی تھی۔ بھیڑیئے اِدھر اُدھر مرے پڑے تھے۔ بُل ٹیر الگ مرا پڑا تھا۔

اسلم مر چکا تھا۔ رزاق اس کے قریب پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ لڑکے پانی کی تلاش میں بھاگنے دوڑنے لگے مگر پانی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں رزاق کے پاس بیٹھ گیا۔ راجہ شاہباز خان بھی ہمارے قریب بیٹھ گیا۔ رزاق نے سرگوشی میں پوچھا "اچھو کیسا ہے؟ اس کے زخم گہرے تو نہیں؟" ــــ میں نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے کیونکہ میری چیخ نکل چلی تھی۔ راجہ شاہباز خان نے سر ہلایا۔ رزاق کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

وہ سر کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے سر گھما کر اسلم کو دیکھا اور ہاتھ لمبا کر کے اسلم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اس نے مجھے قریب ہونے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں تین چار لڑکے پگڑیاں پھاڑ کر رزاق کے زخم صاف کرنے لگے۔ رزاق نے دھیمی آواز میں کہا "رہنے دو۔ بات ختم ہو گئی ہے۔ زخم نہ باندھنا۔ جو ہونا تھا ہو گیا"

میں نے منہ رزاق کے منہ کے قریب کیا۔ راجہ شاہباز خان بھی آگے کو جھکا۔ رزاق مسکرانے لگا۔ "اللہ اسے بہشت میں جگہ دے۔ کیسی پیاری مسکراہٹ تھی۔ ایک مرد کا بچہ مسکرا رہا تھا۔ اور وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے کہا "صاحبو! تم نے کہا تھا کہ گاؤں میں ایک نہیں دو لاشیں جائیں گی۔ دیکھ لو دو ہی لاشیں جا رہی ہیں.... گاؤں والوں سے کہنا کہ یہ دشمنوں کی نہیں دوستوں کی لاشیں ہیں۔ انہیں بتا دینا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو قتل نہیں کیا، ایک دوسرے کو بچانے کے لیے جانیں دی ہیں۔ ہم دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا۔ یہ میری وصیت ہے.... میرے باپ سے کہنا کہ دشمنی ختم کر دو" ــــ پھر اس نے کچھ اور کہنے کی کوشش کی لیکن ہونٹ صرف کانپے، کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھُل گئیں اور پھر آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ ہونٹ آدھے کھلے رہے۔ میں نے، راجہ شاہباز خان نے اور باقی لڑکوں نے اسے جھنجھوڑا ہلایا۔ باری باری آوازیں دیں۔ پھر ہماری آوازیں ہچکیاں اور سسکیاں بن گئیں مرتے وقت اسلم کا ہاتھ رزاق کے ہاتھ میں تھا۔

کُتے بھوکے تھے۔ وہ بھیڑیوں کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ لڑکوں نے اسلم اور رزاق کی لاشیں اٹھائیں۔ ایک نے مجھے اپنی پیٹھ پر سوار کر لیا۔ ہم ڈرنے والے تو نہیں تھے لیکن زندگی میں پہلی بار مجھے ڈر لگا۔ ارد گرد کی پہاڑیوں سے ڈر آنے لگا جیسے یہ جنّوں اور

بھوتوں کا دیس ہو۔ میں ایک غار میں دو انسانی پنجر دیکھ آیا تھا اور اب ہم دو لاشیں اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ ہم ٹھوکریں کھاتے سڑک تک پہنچے۔ اللہ نے مدد کی کہ ایک بیل گاڑی سڑک پر جاتی مل گئی۔ خالی تھی۔ گاڑی والے کو معاملہ ماجرا سنایا تو وہ ہمارے گاؤں چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ لاشیں گاڑی میں رکھیں اور ہم سب گاڑی پر چڑھ گئے۔ کتے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

اور جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو وہ میں آپ کے تصور پر چھوڑتا ہوں کہ دو نوجوان لڑکوں کی لاشیں دیکھ کر گاؤں میں کیا کہرام بپا ہوا ہوگا۔ عورتوں نے ہمارا جو حشر کیا وہ الگ کہانی ہے۔ مردوں نے کچھ نہ کہا۔ ہم نے اسلم اور رزاق کے والدین کو ان کی موت کا قصہ سنایا۔ پھر گاؤں کے تمام مردوں میں بیٹھ کر انہیں مکمل طور پر بتایا کہ کس طرح رزاق اسلم کو قتل کرنے کے لیے ہمارے ساتھ گیا تھا مگر وہ ایک دوسرے کو کس طرح بچاتے ہوئے مرے۔ ہم نے انہیں رزاق کی وصیت بھی بتائی۔ رزاق کے والد نے کہا — "ایک ہی قبر میں دفن کرنا جائز نہیں۔ قبریں اکٹھی بنائیں گے" — یہ کہہ کر رزاق کے والد نے اسلم کے والد کو گلے لگا لیا اور دونوں ایک دوسرے کے سینے سے لگے دھاڑیں مار مار کر بہت دیر روتے رہے۔

دونوں جنازے اکٹھے اٹھے۔ اکٹھے جنازے پڑھے گئے۔ قبریں ساتھ ساتھ کھودی گئیں۔ دونوں کو دفن کر کے وہیں راضی نامہ کیا گیا اور اپنے اپنے بیٹوں کی قبروں پر ہاتھ رکھ کر دونوں باپوں نے دشمنی ختم کرنے کی قسمیں کھائیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، ہمارے علاقے میں یہ واحد مثال ہے جہاں دو خاندانوں نے ہمیشہ کے لیے دشمنی ختم کر دی ہو۔

آج ان دو قبروں کی کہانی سنانے کے لیے میں اور راجہ شاہباز خان زندہ ہیں۔

ہم کبھی کبھی ان قبروں پر جاتے ہیں، فاتحہ پڑھتے ہیں اور چادروں سے قبروں سے گرد جھاڑتے ہیں، انہی چادروں سے اپنے آنسو پونچھتے ہیں اور پھر ہر ایک دوست کی قبر پر فاتحہ پڑھتے در گرد جھاڑتے قبرستان سے نکل آتے ہیں۔

وہ تھا تو کُتا لیکن....

ایک خونخوار کُتے کا ایثار جو شاید انسانوں میں بھی نہیں
ہوتا۔ ایک ایسا ڈرامہ جو آپ کو ہنسا کر رُلا دے گا۔

یہ کہانی میری نہیں۔ یہ ایک کُتے کی کہانی ہے۔

میری کہانیوں سے آپ نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میری زندگی حادثوں سے بھری ہوئی ہے جوانی ختم ہوئی تو حادثے بھی ختم ہو گئے۔ پھر میں نے اپنی جوانی اپنے بچّوں کو دینی شروع کر دی۔ باپ کے پاس یہی ایک ورثہ ہوتا ہے جو وہ اپنے بچّوں کو دیتا ہے۔ اب عمر کے آخری حصّے میں میرے ساتھ یہ حادثہ ہو رہا ہے کہ مجھے جوانی کی کہانیاں لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ میرا دل یہی چاہتا ہے کہ جوانی کی ساری کہانیاں ایک ہی بار سُنا ڈالوں۔ ماضی کو یاد کر کے لطف سا آتا ہے مگر حادثہ یہ ہے کہ چند ایک حادثے ایسے ہیں جو میں یاد نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ یاد آ جاتے ہیں پھر دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ دوستوں کی موت کا غم نڈھال کر دیتا ہے۔ آج مجھے ایک دوست یاد آ رہا ہے۔ اس کا نام "ہلاکو" تھا لیکن وہ انسان نہیں کُتا تھا۔

ہلاکو خونخوار کُتا تھا۔ وہ جب ہماری ٹیم میں شامل ہُوا اس وقت ٹیم میں سولہ کتے تھے جن کا لیڈر بُوبلی تھا۔ میری کہانیوں میں آپ نے بُوبلی کے متعلق کئی بار پڑھا ہوگا۔ یہ بھی خونخوار قسم کا لڑاکا کُتا تھا۔ شکار کا ماہر اور دلیر۔ اس نے اکیلے دو بھیڑیوں سے بھی مقابلہ کیا اور انہیں مار کر دم لیا تھا۔ اس کے کارنامے بے شمار ہیں۔ اسے ہماری ٹیم اپنا لیڈر تسلیم کرتی تھی کیونکہ سارے کتے اس سے ڈرتے تھے۔ مگر ہلاکو اس ٹیم میں شریک ہُوا تو بُوبلی کی لیڈری خطرے میں پڑ گئی۔ ہلاکو نے آتے ہی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی۔ وہ ٹیم کے کسی کُتے کو اونچی آواز سے بھونکنے بھی نہیں دیتا تھا۔ ہلاکو کو پہلے ہی شکار پر لے گئے تو اس نے شکار کی طرف توجہ دینے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ تمام کُتوں کو بتا دے کہ آج سے میں تمہارا لیڈر ہوں۔ اُس روز بُوبلی اور ہلاکو کے پہلا اور آخری معرکہ لڑا جس کے نتیجے میں بُوبلی کی لیڈری ختم اور ہلاکو کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی۔ الیکشن نہ ہوئے، کسی کُتے سے رائے نہ لی گئی۔ ہلاکو نے بُوبلی کی گردن اپنے اتنے بڑے منہ میں لے کر اسے جھنجھوڑا۔ دو تین پٹخنیاں دیں اور صاحبِ اقتدار بن گیا۔ اس نے تمام کُتوں کو غرا کر للکارا لیکن تمام کُتوں نے منہ موڑ لیے۔ بُوبلی کو ہم نے دیکھا۔ وہ ٹیم کے تین نامور کُتوں کے پاس باری باری گیا۔ ان کے ساتھ منہ لگا کر تھوڑی تھوڑی دُور ہر ایک کے ساتھ چلا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک مضبوط اپوزیشن بنانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن کسی نے بھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کے عدمِ تعاون کی وجہ یہ تھی کہ بُوبلی جو اب مار کھا کر بھیگی بلّی بنا ہُوا تھا ہلاکو کی ہی طرح طاقت کی دھاندلی سے لیڈر بنا تھا۔ سولہ کُتوں میں اسے کوئی بھی لیڈر نہ ملا۔ سب عوام بن چکے تھے۔ بُوبلی سب سے الگ ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے غیر ملکی امداد ڈھونڈ رہا ہو۔

یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب کہ ہم ہلاکو کو پہلے شکار پر لے گئے تھے اور گاؤں سے دُور جا کر کُتوں کی زنجیریں کھول دی تھیں۔ ہلاکو نے پہلا کام یہ کیا کہ بُوبلی پر حملہ کر دیا جو اس نے بغیر کسی اشتعال

کے کیا تھا۔ بُوہلی نے مقابلہ تو بہت کیا مگر مارا گیا۔ ہم کُتوں کی نفسیات کو جانتے تھے اس لیے ہم نے چھڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم جانتے تھے کہ ہلاکو نے سولہ کُتوں میں ایک بُوہلی پر صرف اس لیے حملہ کیا ہے کہ اسے بُوہلی سب سے زیادہ طاقتور نظر آیا۔ کُتوں میں بے چینی سی پیدا ہوگئی۔ وہ سب ہلاکو سے دُور رہے تھے لیکن ہلاکو نے کسی اور پر حملہ نہیں کیا۔ دو میل آگے گئے تو کھڈ نالوں کا علاقہ شروع ہوگیا۔ کُتے بکھر کر آزادی سے چلے جا رہے تھے۔ بُوگیر کُتے ناک زمین سے لگائے ہر طرف دوڑتے پھر رہے تھے۔ اچانک ایک تازی کُتا آگے کو دوڑ پڑا۔ اسے دیکھ کر دوسرا تازی کُتا بھی دوڑ پڑا۔ ہم نے دیکھا۔ کوئی تین سو گز دُور ایک خرگوش پوری رفتار سے بھاگا جا رہا تھا۔ کُتوں نے اسے اور اُس نے کُتوں کو دیکھ لیا تھا۔

خرگوش کی رفتار بہت ہی تیز ہوتی ہے۔ اُچھلتا اور تیر کی طرح آگے جاتا ہے۔ اسے صرف تازی نسل کے کُتے ہی پکڑ سکتے ہیں۔ تازی کُتا ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتا ہے جسے خدا نے صرف رفتار دی ہے۔ وہ کُتوں کی طرح لڑا کا نہیں ہوتا۔ شکار کتنا ہی تیز ہو، تازی کُتا اُسے جا لیتا ہے اور اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح اس کی رفتار سُست ہو جاتی ہے۔ اتنے میں دوسرے کُتوں کی ٹیم پہنچ جاتی اور شکار پر لپٹ لیتی ہے۔ ہمارے دونوں تازی کُتے دوڑتے نظر آئے اور کھڈ نالوں میں غائب ہوگئے۔ باقی کُتے اُن کے پیچھے دوڑ پڑے۔ شکار کی فضا عود کر آئی۔ ہم بھی دوڑنے لگے۔ ہلاکو بھی کُتوں کے پیچھے دوڑا لیکن اُس کا جسم بھاری ہونے کی وجہ سے وہ پیچھے رہ گیا۔ وہ لڑنے والا کُتا تھا شکاری نہیں تھا۔ طاقتور اور خونخوار اتنا تھا کہ شیر سے بھی لڑ جاتا لیکن شیر کے تعاقب کے قابل نہیں تھا۔ ہم دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ ہلاکو ہم سے تھوڑا ہی آگے تھا۔

کچھ اور آگے گئے تو کُتے نظر آگئے۔ انہوں نے خرگوش کو پکڑ لیا تھا اور اسے بوٹی

بوٹی کر کے کھا بھی چکے تھے۔ جب ہلاکو وہاں پہنچا تو خرگوش کے بالوں، کھوپڑی اور پاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس نے غصے سے تمام کُتوں کو دیکھا اور غرّایا۔ تمام کُتے دُور کر دُور ہٹ گئے۔ ہلاکو بُوہلی کی طرف بڑھا لیکن بُوہلی سر نیچے کر کے ہماری طرف آگیا۔ ہلاکو نے زور سے غرّا کر تمام کُتوں کو خبردار کر دیا کہ آئندہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کُتا شکار نہیں کھائے گا۔ کُتے ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ ہمیں اُس وقت پتہ چلا جب آگے جا کر ایک گیدڑ اپنے بِل میں سے نکل کر بھاگا اور کُتے اس کے پیچھے دوڑنے لگے تو ہلاکو نے ایک بُل ٹیریر پر حملہ کر دیا۔ دوسرے کُتے ڈر کر ایک طرف ہوگئے۔ ہلاکو نے اسے چھوڑ دیا اور دوسرے کُتوں پر ایسے طریقے سے غرّایا کہ وہ رُک کر اِدھر اُدھر ہوگئے۔ گیدڑ غائب ہوگیا۔ ہلاکو کی یہ حرکت شکار کے اصولوں کے خلاف تھی۔ لہٰذا اسے ٹریننگ دینے کی ضرورت تھی۔ ٹریننگ کے لیے یہ بہت ہی ضروری ہوتا ہے کہ کُتوں میں ٹیم سپرٹ اور ایک دوسرے سے پیار سکھایا جائے۔ کُتے کے دل میں کُتے کا پیار پیدا کرنا، آپ جانتے ہیں، کتنا مشکل کام ہے۔ ہم یہ کام کر لیا کرتے تھے۔

ہلاکو کی بھی ہم نے دوسرے دن سے ٹریننگ شروع کر دی۔ کُتے کو آپ لیکچر تو نہیں دے سکتے اور وہ میم۔ الف صاحب کے مضمون بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اسے دوسرے کُتوں میں شامل کر کے ایک مشترک دشمن دکھایا جاتا ہے اور ایسے کئی ایک طریقے تھے جو ہم نے اختیار کر کے کُتوں کو ایک ٹیم میں متحد کر لیا تھا لیکن ہلاکو نے ہمارے تمام طریقے رد کر دیے۔ وہ نہ جمہوریت کا قائل تھا نہ سوشلزم کا۔ وہ ڈکٹیٹر شپ چاہتا تھا۔ پہلے تو اُس نے تین کُتوں کی مرمت کر دی اور جب اس پر تشدد کیا گیا تو اُس نے اختر کو کاٹ کھایا۔ اسے ہم نے خوب پیٹا لیکن اُس پر اُلٹا اثر ہُوا۔ وہ زنجیر چھڑا کر گاؤں کی طرف بھاگا۔ ہم گاؤں سے دُور تھے۔ اس کے پیچھے دوڑے۔ جب گاؤں میں پہنچے تو وہاں قیامت مچی ہوئی تھی۔ ہلاکو نے ایک بکری پر اس

طرح حملہ کر دیا تھا کہ اس کی شہ رگ دانتوں میں لے کر چیر دی تھی۔ گاؤں کے لوگ اسے مارنے کو دوڑے تو اس نے دو آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ کچھ لوگ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کے نکل آئے۔ انہیں یہ شک ہو گیا تھا کہ ہلاکو باؤلا ہو گیا ہے۔ اس لیے اسے مار دینا ضروری ہے۔

ہم گاؤں میں پہنچے تو گاؤں کی آدھی آبادی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھی اور ہلاکو ان کے گھیرے میں آیا ہوا بڑے مزے سے ٹہل رہا تھا۔ عورتوں نے حسب معمول ہمیں گالیاں دینی شروع کر دیں۔ بوڑھوں نے بھی برا بھلا کہا اور اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ یہ کتا باؤلا ہو گیا ہے۔ ہم کتوں کے ماہر تھے۔ اس میں باؤلے پن کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اس کے منہ میں جھاگ نہیں تھی۔ باؤلا کتا ایک جگہ رکتا نہیں۔ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ اور راستے میں کوئی حیوان یا انسان آ جائے تو اسے کاٹ کھاتا ہے۔ اس طرح آرام سے نہیں ٹہلتا ـــــ میں اور اختر اس کی طرف بڑھے۔ اختر کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہلاکو سر جھکا کر اور دم ہلاتا ہوا ہماری طرف آیا۔ وہ پہلے اختر کی ٹانگوں کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا پھر منہ اوپر کر کے اس نے میرے منہ کی طرف دیکھا جیسے مجھ سے پوچھ رہا ہو "تم بھی ناراض ہو؟" ـــــ وہ اختر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے ساتھ اپنا جسم رگڑنے لگا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ معافی مانگ رہا تھا یا شاباش۔

ہم تو اسے معاف کر سکتے تھے مگر اس نے ایک ہی ہلّے میں سارے گاؤں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ رائے عامہ اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ سب نے متفقہ فیصلہ دے دیا کہ یہ کتا گاؤں میں نہیں رہے گا۔ یہ پہلا کتا تھا جس کے خلاف گاؤں نے ایسا سخت مخالفانہ رویّہ اختیار کیا۔ ہمارے شکار کے جنون کو ہماری مائیں اور بہنیں ناپسند کرتی تھیں کیوں کہ ہم اکثر زخمی ہو کر واپس آیا کرتے تھے اور یہ تو میں آپ کو پہلی کہانیوں میں سنا چکا ہوں کہ ہمارے کچھ دوست مارے بھی گئے تھے۔ البتہ ہمارے باپ، چچے، تائے، ماموں، بڑے بھائی اور سارے بزرگ ہمیں

شکار سے نہیں روکتے تھے۔ وہ ہمیں مرد بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے کسی بھی کتے کے خلاف انہیں کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ ہمارے تمام کتے گاؤں کے بچے بچے سے پیار کرتے تھے۔ ہلاکو پہلا کتا تھا جس نے پورے گاؤں کو صرف اپنا ہی نہیں ہمارا بھی دشمن بنا دیا۔ لیکن ہم بھی ڈھیٹ قسم کے تھے۔ ہلاکو نے جس بکری کی شاہ رگ کاٹ دی تھی وہ ابھی مری نہیں تھی۔ ہم نے بکری کی گردن پر تکیہ رکھ کر پھیری پھیر دی اور تمام شکاریوں نے اتنے پیسے جمع کر کے بکری والے کو دے دیئے جن سے وہ دو بکریاں خرید سکتا تھا۔ وہ غریب آدمی تھا۔ خوش ہو گیا۔ ہم نے بکری کا گوشت سارے گاؤں میں تقسیم کرنا چاہا مگر کسی نے بھی قبول نہ کیا۔ وہ ڈرتے تھے کہ باؤلے کتے کی کاٹی ہوئی بکری کا گوشت کھا کر سارا گاؤں باؤلا ہو جائے گا۔

ہم بہت خوش ہوئے کہ ساری بکری ہم خود کھائیں گے مگر ماؤں نے اودھم مچا کر دیا۔ ہم نے انہیں یقین دلایا کہ نہیں کھائیں گے۔ ہم نے بکری ایک گدھے پر لاد دی۔ ایک لڑکا گھر سے نمک چرا لایا۔ گاؤں والوں کو بتایا کہ اسے بہت دور پھینک آئیں گے۔ ہم نے ہلاکو کو بھی ساتھ لیا۔ گاؤں سے ایک میل دور ایک گہرائی میں بیٹھ کر ایک ران ہلاکو کو پیش کی اور لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی۔ بکری کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹ کر آگ میں رکھ دیئے۔ روسٹ ہو گئے تو ہم نے کھا لیے۔ اس طرح اٹھارہ انیس لڑکوں اور ہلاکو نے مل کر پوری بکری کھا لی۔ واپس آ کر ہم نے بزرگوں کو بتایا کہ بکری کو ایک گڑھے میں ڈال کر اوپر مٹی ڈال آئے ہیں تاکہ کوئی کتا اسے کھا نہ لے۔ بزرگ یہ سن کر خوش ہوئے کہ لڑکے سیانے ہو گئے ہیں۔ لیکن ہلاکو کے خلاف جو آواز اٹھ چکی تھی وہ ختم ہونے کا بجائے اور اونچی ہو گئی۔

ہلاکو ہمارے گاؤں کی کسی کتیا کا بچہ نہیں تھا۔ وہ ہمیں اتفاق سے ملا تھا۔ ایک بار ہم شکار کے لیے گئے تو ایک جگہ خانہ بدوشوں کا قافلہ رکا ہوا تھا۔ اب تو اس قسم کے خانہ بدوش

کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ ایک عجیب اور پُراسرار نسل تھی۔ ان کے متعلق بڑی ڈراؤنی سی روایتیں مشہور تھیں جن میں ایک یہ بھی کہ یہ بچوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں اور انہیں لٹکا کر نیچے ایک برتن رکھ دیتے ہیں۔ برتن کے نیچے آگ جلاتے ہیں۔ آگ کی تپش سے بچے کے سر میں سے مومیائی نکلتی ہے۔ یہ دوائی کے طور پر استعمال ہوتی ہے جو آبِ حیات کا اثر رکھتی ہے۔ اس روایت سے لوگ اتنا ڈرتے تھے کہ جب کبھی خانہ بدوش قافلہ کسی گاؤں کے قریب ڈیرے ڈالتا تھا تو لوگ بچوں کو گاؤں سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ ان خانہ بدوشوں کے پاس خونخوار کتے ہُوا کرتے تھے جن میں زیادہ تر بھیڑیوں کی نسل کے ہوتے تھے یا ہالاکو کی نسل کے لڑاکے اور خونخوار۔ ایسا ہی ایک قافلہ ہمیں ایک شکار کے دوران ایک جگہ رُکا ہُوا مل گیا تھا۔ خانہ بدوشوں کے کتے ہمارے کتوں پر غرّانے لگے لیکن خانہ بدوشوں نے انہیں روک دیا۔ ہم وہاں رُک گئے اور گپ شپ لگانے لگے۔

ہم نے دیکھا کہ ایک بُل ڈاگ ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ اس نے ایک بار منہ زمین سے اُٹھایا اور کھانسنے لگا۔ کھانسی کا دَورہ اتنا شدید تھا کہ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور پھر اس طرح بیٹھ گیا جیسے جسم میں طاقت نہ رہی ہو۔ خانہ بدوشوں سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ بہت دنوں سے بیمار ہے اور ٹھیک نہیں ہو رہا۔ وہ اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن وہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے یہ اُن کے پیچھے پیچھے چلا جاتا تھا۔ اب انہوں نے اس کی خوراک بند کر دی تھی۔ وہ خود شکار کے قابل نہیں رہا تھا ــــ ہمیں کتوں کے ساتھ دلچسپی تھی اور ہمدردی بھی۔ یہ کتا ہمیں بڑے کام کا نظر آیا۔ ہمارے پاس بُوبلی خونخوار کتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ ایک اور مل جائے تو بوبلی کا ساتھ ہو جائے گا۔ میرے دوست اختر نے مشورہ دیا کہ اگر خانہ بدوش کتا دے دیں تو اسے ہم ٹھیک کر لیں گے۔ اگر اس کا مرض لاعلاج ہُوا تو زہر

دے کر مار دیں گے۔

خانہ بدوشوں سے یہ کتا مانگا تو انہوں نے خوشی سے دے دیا لیکن انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ بڑا ہی ظالم کتا ہے جب بگڑ جاتا ہے تو مالک کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ انہوں نے ہمیں خبردار کیا کہ اگر یہ ٹھیک ہو گیا تو اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم شکار سے واپس آئے تو کتے کے گلے میں زنجیر ڈال کر اسے کھینچا۔ وہ بہت کمزور تھا۔ اس نے اُداس اُداس نظروں سے ہمیں دیکھا جیسے رحم کا طلب گار ہو۔ ہم نے اسے تھپکیاں دیں اور پیار کیا۔ وہ آہستہ آہستہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ایک جگہ اسے کھانسی آئی اور وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔ ہم سب لڑکے باری باری اسے اُٹھا لائے۔ ہمارے اپنے ٹوٹکے ہُوا کرتے تھے۔ گاؤں کے ایک بزرگ بھی جڑی بوٹیوں سے جانوروں کا علاج کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کتے کو دیکھ کر کہا کہ اس کے پیٹ میں کوئی زہریلا کیڑا چلا گیا ہے جو ابھی زندہ ہے اور آہستہ آہستہ اس کی جان لے رہا ہے۔ انہوں نے دو دن اسے اپنے دیسی ٹوٹکے دیئے۔ ہمارے دوست اختر نے اسے اپنے گھر رکھ لیا اور اس کی تیمارداری کرتا رہا۔ بزرگ کے کہنے پر وہ کتے کو دودھ میں کالی مرچیں اور گھی ملا کر پلاتا رہا۔ سات آٹھ روز بعد کتے کی صحت اچھی ہونے لگی اور تھوڑے دنوں بعد کتا اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔ اس وقت ہمیں پتہ چلا کہ یہ کتا عام قسم کا بُل ڈاگ نہیں ہے بلکہ یہ شک ہُوا کہ اس کی ماں اچھی نسل کی کُتیا ہے اور باپ کتا نہیں بلکہ کوئی درندہ ہے۔ ہم نے اس کی خونخواری اور طاقت کا اندازہ اس کی شکل و صورت، اس کے سینے کی چوڑائی اور پنجوں کے سائز سے کر لیا تھا۔ اس لیے ہم نے اس کا نام ہالاکو رکھا۔

اختر اس کا مالک تھا اور محسن بھی مگر اس نے پہلے شکار پر اختر کی ٹانگ میں ہی دانت گاڑ دیئے تھے۔ پھر اس نے ہمارے بُوبلی کو شکست دے کر اس کی لیڈری ختم کر دی۔ ہم نے

اس کے دل میں دوسرے کتوں کا پیار پیدا کرنے کی جو بھی کوشش کی، ناکام ہو گئی۔ اس دوران ایک بکری کو مار کر اس نے ایک بھینس پر بھی حملہ کیا اور اس کی دو ٹانگیں زخمی کر دیں۔ گاؤں والے پہلے ہی اس کے خلاف تھے، اب اور زیادہ اس کے دشمن بن گئے: اختر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے بہت لاڈلا تھا۔ اسے ماں باپ نے کہا کہ یہ کتا کسی کو دے دو کیونکہ یہ بہت خطرناک ہے لیکن اختر نے ان کا کہا نہ مانا اور ماں باپ اس کی خوشنودی کے لیے خاموش ہو گئے۔

ہم گاؤں والوں کی گھرکیاں سہتے رہے اور یہ احتیاط کرنے لگے کہ کتے کو کھلا نہ چھوڑا جائے۔ ہم ہلاکو سے دستبردار نہ ہوئے۔ ایک روز ہم پھر کتوں کی ٹیم لے کر شکار کو نکلے۔ گاؤں سے دور نکل گئے تو ہم نے کتوں کی زنجیریں پٹوں سے الگ کر دیں۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ ہم آگے کو جا رہے تھے۔ وہ دائیں طرف سے آ رہا تھا۔ کتے بکھرے ہوتے آگے جا رہے تھے۔ گھوڑ سوار ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ گھوڑا بڑا اچھا تھا۔ وہ جب ہمارا راستہ کاٹ کر کتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا تو اس نے ہمیں دو چار تعریفی جملے کہے اور پھر ہمارے کتوں کی تعریف کرتا ہوا آگے چلا گیا۔ میں نے اتفاق سے ہلاکو کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جگہ رکا ہوا زمین کو سونگھ رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کو دیکھا جو تھوڑی دور چلا گیا تھا۔ وہ پہلے تو آہستہ آہستہ گھوڑے کو دیکھتا ہوا اس کی طرف چلتا رہا پھر وہ بھونکا اور وہ گھوڑے کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اس کے غرانے اور بھونکنے کی آوازوں پر گھوڑا بدک گیا اور سرپٹ بھاگ اٹھا۔ سوار نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی لیکن گھوڑا منہ زور ہو گیا۔ ہم ہلاکو کو روکنے کے لیے دوڑے۔ ہمیں ڈر یہ تھا کہ گھوڑا سوار بگڑ گیا تو بات بہت دور تک پہنچ جائے گی مگر ہلاکو کو پکڑنا ہمارے لیے آسان نہیں تھا۔

اس کے ساتھ دوسری مصیبت یہ آئی کہ ہم جب دوڑے تو ہمارے کتوں کی پوری ٹیم دوڑ پڑی۔ کتے گھوڑے کو شکار سمجھ بیٹھے۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ کتوں کو باندھ لو۔ بہت سے لڑکوں نے کتوں کو روکنا شروع کر دیا۔ اتنی دیر میں ہلاکو گھوڑے تک پہنچ چکا تھا۔ یہ کامیابی اس کے لیے اس طرح آسان ہو گئی تھی کہ آگے ایک ٹیلا آ گیا تھا جس نے گھوڑے کو بائیں طرف مڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہلاکو جہاں تھا وہیں سے مڑا اور گھوڑے تک پہنچ گیا۔ ہم اس طرف دوڑے جا رہے تھے لیکن ہم گھوڑے کی رفتار سے تو نہیں دوڑ سکتے تھے۔ ہلاکو نے اچھل کر گھوڑے کے پیٹ پر پنجے مارے۔ سوار نے اپنی جان بچانے کے لیے سرپٹ بھاگتے گھوڑے سے چھلانگ لگا دی۔ اس نے بہت لڑھکنیاں کھائیں۔ لیکن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ زمین کچی اور کچھ ریتلی بھی تھی۔ اب گھوڑا اور ہلاکو رہ گئے۔ گھوڑا آگے سے مڑا اور ہلاکو اس سے ذرا پیچھے رہ گیا۔ گھوڑے نے دوڑتے دوڑتے اس کو دولتی ماری جو ہلاکو کو لگی لیکن وہ ذرا دور ہونے کی وجہ سے دولتی کی پوری ضرب کی زد میں نہ آیا۔ البتہ ایک طرف کو گرا اور ایک قلابازی کھا کر پھر گھوڑے کے پیچھے دوڑا۔

ہم نے دوسرے کتوں کو روک لیا تھا لیکن بوہلی ہاتھ سے نکل گیا۔ پہلے تو اس نے گھوڑے اور ہلاکو میں کوئی دلچسپی نہ لی لیکن ہلاکو کو دولتی پڑی تو بوہلی اچانک دوڑ پڑا۔ ہم سمجھے کہ وہ ہلاکو پر حملہ کرنے جا رہا ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ دولتی کھا کر کمزور ہو گیا ہے اس سے انتقام لے گا۔ لیکن وہ سیدھا گھوڑے کی طرف گیا۔ ہلاکو اب پھر گھوڑے کے قریب تھا۔ گھوڑے نے اب کے ایک ہی ٹانگ پیچھے کو ماری تو ہلاکو نے کئی قلابازیاں کھائیں۔ بوہلی گھوڑے کے آگے تھا اس نے اچھل کر گھوڑے کی گردن نیچے سے منہ میں لے لی۔ گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور رکنے لگا۔ ہلاکو نے پیچھے سے جست لگائی اور اس کے پچھلے حصے

میں پنجے اور دانت گاڑ دیے مگر گر پڑا۔ بوہلی نے گھوڑے کی گردن نہ چھوڑی۔ وہ اس کی اگلی ٹانگوں کے اُوپر والے حصے کے ساتھ چپک گیا تھا۔ گھوڑا اتنا بے بس ہو گیا کہ اس کی اگلی ٹانگیں دُہری ہو گئیں۔ وہ بیٹھنے لگا۔ ہلاکو آگے ہو کر اس کی گردن کے اوپر سوار ہو گیا۔ اب اس کی گردن دو کتوں کے جبڑوں میں تھی۔ گھوڑا بیٹھ گیا۔ وہ حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔

ہم پہنچ گئے۔ بوہلی تو ہمارا حکم مانتا تھا۔ اسے پچھلی ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور دُلکارا تو اس نے گھوڑے کی گردن چھوڑ دی لیکن ہلاکو سے گھوڑے کی گردن چھڑانا بڑا ہی خطرناک تھا۔ وہ گردن کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ یہ شیروں اور چیتوں کا طریقہ ہوتا تھا۔ یہ درندے بھینسوں اور گھوڑوں کو اسی طرح مارتے ہیں۔ اوپر سے گردن کی ہڈی توڑ دیتے ہیں۔ ہم نے گھوڑے کو بچانے کے لیے خطرہ مول لیا۔ دو زنجیریں ہلاکو کی گردن کے گرد لپیٹ کر اسے پیچھے کو کھینچا۔ ڈر یہ تھا کہ وہ گھوڑے کو چھوڑ کر کسی لڑکے کو چیر پھاڑ دے گا۔ اس کے مالک اختر نے یہ خطرہ مول لیا کہ اس کی ناک پر ہاتھ رکھ کر اس کا سانس روک دیا۔ گھوڑا تڑپ رہا تھا۔ ہلاکو کا منہ اکھڑ گیا۔ ہم نے زنجیریں کس لیں۔ ہلاکو میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ہماری گرفت سے نکل سکتا تھا لیکن یہ اس کی شرافت تھی کہ ہمارے قابو میں آ گیا۔

گھوڑا بجلی کی تیزی سے اُٹھا۔ ہم یہی دیکھ سکے کہ اس کی گردن لہولہان ہو چکی تھی۔ گھوڑا بے حد تیز رفتاری سے دوڑ پڑا۔ وہ اُسی طرف جا رہا تھا جس طرف سے آیا تھا۔ ہم نے اسے پہلے بھی دوڑتے دیکھا تھا مگر اب کتوں سے آزادی حاصل کر کے جس رفتار سے وہ بھاگا وہ میں نے آج تک کسی گھوڑے میں نہیں دیکھی۔ ہم اس کے سوار سے معافی مانگنا چاہتے تھے مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم دوسرے کتوں کو روکنے اور ہلاکو کو پکڑنے میں اُلجھے رہے۔ اس دوران وہ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ ہمیں یہ ڈر محسوس ہوا کہ وہ اپنے گاؤں چلا گیا ہے

اور وہ اپنے ساتھ یا تو بندوق لائے گا یا کچھ آدمیوں کو ساتھ لا کر ہم سے انتقام لے گا۔ ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کر لیا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

گھوڑا نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ہم آگے چل پڑے۔ تھوڑی دُور جا کر ہم نے کتوں کو پھر کھلا چھوڑ دیا۔ ہلاکو کی بھی زنجیر کھول دی۔ اس کے جسم کو اچھی طرح دیکھا۔ گھوڑے کی دولتیوں سے اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ ہم نے ایک عجیب و غریب تبدیلی دیکھی۔ وہ یہ تھی کہ جونہی ہم نے کتوں کو کھلا چھوڑا ہلاکو بوہلی کے قریب چلا گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہلاکو گھوڑے کا غصہ بوہلی پر نکالے گا لیکن اس نے بوہلی کے ساتھ منہ لگا لیا۔ یہ کتوں کا آپس میں محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ دونوں اکٹھے آگے کو چلتے گئے۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ ان کی دوستی ہو گئی ہے۔ بوہلی نے اسے گھوڑے کو گھیرنے میں مدد دی تھی۔ ہلاکو اس کے خلوص اور اس کی طاقت کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ آخر جنگجو تھا۔ اچھا گماشتہ نہیں تھا۔ وہ بوہلی کو خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ اس کے بعد شکار کے دوران ہلاکو نے بوہلی کی کسی حرکت کا بُرا نہیں منایا۔ بوہلی کے متعلق میں نہیں بتا سکتا کہ اس نے گھوڑے جیسے طاقتور جانور کو گھٹنوں بٹھا کر ہلاکو پر اپنی طاقت کا رعب جمایا تھا یا یہ خوشامد کا ایک طریقہ تھا۔ بہرحال بوہلی کا یہ کارنامہ سیاسی قسم کا تھا جس میں وہ کامیاب تھا۔

تھکا کر کے ہم واپس آ رہے تھے تو ہم چوکس تھے کیونکہ ہم یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ گھوڑ سوار انتقام لینے کے لیے اپنے ساتھ بندوق یا بہت سارے آدمی لائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں ڈھونڈ رہا ہو اور یہ بھی ڈر تھا کہ وہ ہمارے گاؤں پہنچ گیا ہو گا۔ یہ صورت ہلاکو کے لیے خطرناک تھی۔ گاؤں والے پہلے ہی اس کے خلاف تھے۔ اب اس کی وجہ سے دشمنی دوسرے گاؤں میں بھی پیدا ہو گئی تھی —— ہم اس نئی صورتِ حال کے متعلق آپس میں تبادلہ خیالات کرتے

ڈرتے ڈرتے گاؤں میں داخل ہوئے مگر وہاں امن اور سکون تھا۔ ہیں اپنے گھر میں داخل ہوا تو بھی کسی نے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ نہا دھو اور کھانا کھا کر ہم سب دوست اکٹھے ہوئے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گاؤں میں کوئی رپورٹ نہیں آئی۔ تب ہمیں یہ ڈر لگا کہ گھوڑ سوار تھانے نہ پہنچ گیا ہو۔

چار دن گزر گئے۔ نہ تھانے سے پولیس آئی نہ گھوڑ سوار آیا۔ ہماری جان میں جان آئی کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔ پانچویں دن ہمارا ایک ساتھی، افضل، مجھے بلانے آیا۔ اُس نے کہا کہ چلو سب کو بُلا لیں۔ اُس نے کہا "بڑا مزیدار قصہ ہے" ـــــ مجھے اس کے یہ الفاظ آج آدھی صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یاد ہیں۔ اُس وقت میری عمر بائیس تیئیس سال تھی۔ تھوڑی سی دیر میں ہم نے تمام لڑکوں کو جمع کر لیا اور افضل کی ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ وہاں افضل کے والد صاحب، چار پانچ اور آدمی اور ایک اجنبی شخص بیٹھا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ آدمی چھ سات کوس دُور کے گاؤں کا رہنے والا آسودہ حال زمیندار تھا۔ افضل کے والد صاحب سے اس کی میل ملاقات تھی۔ وہ اُس روز شہر جا رہا تھا۔ ہمارے گاؤں سے گزرا تو افضل کے والد صاحب کی خیر خیریت معلوم کرنے اور ذرا ستانے کے لیے رُک گیا تھا۔ اُس زمانے میں لوگ کوسوں کی مسافت پیدل طے کیا کرتے تھے۔ وہ افضل کے والد صاحب سے ملا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ پیدل کیوں جا رہا ہے، گھوڑا کہاں ہے؟ ـــــ اس وقت افضل اس کے آگے کھانا رکھ رہا تھا۔

اس شخص نے جواب دیا "گھوڑا زخمی ہو گیا ہے لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ کس طرح زخمی ہُوا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اسے بھیڑیوں نے یا کُتوں نے کاٹا ہے" ـــــ یہ سُن کر افضل چونکا اور وہ اس کی پوری بات سننے کے لیے بیٹھ گیا۔ اُس نے بات یہ سنائی کہ ایک رات

اُس کا گھوڑا چوری ہو گیا۔ ہمارے علاقے میں مویشیوں اور جانوروں کی چوری بہت ہی کم ہُوا کرتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ سُننے میں آتا تھا۔ اس شخص کا گھوڑا ایک مبح کھُرلی سے غائب تھا۔ گاؤں کے آدمی اس کی تلاش میں نکل گئے۔ سُورج ابھی تھوڑا سا ہی اوپر اُٹھا تھا کہ گھوڑا سرپٹ بھاگتا گاؤں میں داخل ہُوا۔ اس کی گردن کے اُوپر اور نیچے گہرے زخم تھے۔ کسی درندے کے پنجوں کے نشان پچھلے حصے پر دُم کے قریب بھی تھے۔ یہ ذرا لمبی اور گہری خراشیں تھیں۔ گھوڑا لہولہان تھا۔ یہ گھوڑے میں قدرتی وصف ہوتا ہے کہ گھر سے اُسے سینکڑوں میل دُور لے جا کر چھوڑ دو، اپنے آپ واپس آ جاتا ہے۔ گھوڑا کُتے کی طرح اپنے گھر اور اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ اس گاؤں کے سارے لوگ حیران تھے کہ گھوڑا کہاں چلا گیا تھا اور وہ کہاں سے زخمی ہو کر واپس آیا ہے۔ بعض نے یہ رائے دی کہ گھوڑا اپنے آپ کھُل گیا ہو گا اور رات کو کہیں بھیڑیوں کی لپیٹ میں آ گیا ہو گا۔ لیکن یہ رائے غلط تھی کیونکہ گھوڑا واپس آیا تو اس کی پیٹھ پر زین کی جگہ کمبل تھا جو "ٹینگ" سے کسا ہُوا تھا اور منہ میں پُرانی سی لگام تھی۔ رکابیں نہیں تھیں۔ رات کے وقت گھوڑا خالی پیٹھ تھا اور یہ کمبل، ٹینگ اور لگام گھر والوں کی نہیں تھی۔ یہ کسی اور کی تھی۔ یہ ثبوت تھا کہ گھوڑا چوری ہُوا تھا۔ بہرحال اس شخص نے گھوڑے کی مرہم پٹی کر دی اور وہ مطمئن تھا کہ زخم ملنے شروع ہو گئے تھے۔

افضل نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ مجھے بلانے آیا اور ہم دونوں اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا کر کے افضل کی ڈیوڑھی میں لے گئے۔ ہم نے اس آدمی سے یہ قصہ از سرِ نو سُنا۔ پھر ہم نے اسے بتایا کہ اگر وہی گھوڑا ہے تو اسے ہمارے دو کُتوں نے زخمی کیا ہے اور اس پر ایک آدمی سوار تھا جس نے گھوڑے سے چھلانگ لگا دی تھی اور وہ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ہم نے اسے گھوڑے کا رنگ اس کی چھاتی پر سفید دھبہ بتایا تو اس نے کہا کہ یہی

گھوڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ زخم کہاں کہاں ہیں اور کیسے ہیں تو ہم نے یقین سے کہا تھا کہ یہی گھوڑا تھا۔ جب کھیل اور لگام کی بات ہوئی اور یہ پتہ چلا کہ رکا ہیں نہیں تھیں تو ہمیں یہ سب کچھ یاد آ گیا۔ دو روز بعد ہم نے اس شخص کے گاؤں جا کر گھوڑا دیکھا۔ یہ وہی گھوڑا تھا لیکن اُس آدمی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ کوئی گھوڑی چور (رستہ گیر) تھا اور گھوڑا چُرا کر لے جا رہا تھا۔ ہلاکو نے چور کو پکڑ لیا۔ چور گھوڑے سے کُود کر غائب ہو گیا۔ اور گھوڑا گھر پہنچ گیا۔

یہ کہنا تو بالکل ہی غلط ہے کہ ہلاکو کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ گھوڑا چوری کر کے لے جایا جا رہا ہے۔ وہ گنتا تھا، جوتشی یا کھوجی نہیں تھا۔ ہم ہلاکو کو جانتے تھے۔ اس نے گھوڑے پر توقیہ حملہ کیا تھا۔ وہ خود سر گنتا تھا۔ اس میں ڈسپلن بالکل نہیں تھا۔ لہٰذا ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ اُس نے محض تشفی اور شوق کی خاطر گھوڑے پر حملہ کیا تھا۔ لیکن گھوڑے کے مالک نے بتایا کہ ہلاکو کا حملہ دیرینہ عداوت کی بنا پر تھا۔ اُس نے ہمارے گاؤں میں ہلاکو کو دیکھا تھا۔ ہم نے اسے ٹوپلی بھی دکھائی تھی۔ ہلاکو کو دیکھ کر اُس نے ہنس کر پوچھا کہ یہ کُتا یہاں کس طرح آیا ہے۔ ہم نے بتایا کہ خانہ بدوشوں سے لیا ہے۔ اُس نے ہلاکو کے متعلق ہمیں ایک دلچسپ قصہ سُنایا۔

"تین چار مہینے پہلے کا ذکر ہے کہ یہ آدمی اسی گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں خانہ بدوشوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ کُتا کھلا پھر رہا تھا۔ یہ شخص قریب سے گزرا تو کُتا (ہلاکو) گھوڑے کے پیچھے آ گیا اور غرّایا۔ گھوڑے نے رُک کر ایسی دولتی جھاڑی کہ کتا دُور جا پڑا۔ وہ اُٹھ کر گھوڑے سے انتقام لینے کے لیے آیا لیکن خانہ بدوشوں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔ کُتا اُن کے قابو سے باہر ہُوا جا رہا تھا۔ یہ شخص گھوڑے کو ایڑ لگا کر دُور نکل گیا۔

ہم سارا معاملہ سمجھ گئے۔ مجھے یاد آیا کہ جب چور گھوڑے پر سوار تھا اور ہمارے کُتوں کے

قریب سے گھوڑا گزر گیا تھا تو ہلاکو زمین کو سُونگھ رہا تھا۔ پھر وہ سُونگھتا ہُوا تھوڑی دُور گیا تھا اور پھر وہ اچانک گھوڑے کے پیچھے دوڑ پڑا اور اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اُسے اس گھوڑے کی بُو یاد تھی جسے سُونگھ کر اس کو پہچان لیا تھا کہ اسی گھوڑے نے کچھ عرصہ پہلے اسے ہلاکو دولتی ماری تھی اور وہ انتقام نہیں لے سکا تھا۔ لہٰذا اسے انتقام کا موقع مل گیا۔ اسے گھوڑے کے سوار کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ اسے یہ خیال تھا کہ گھوڑا چوری کر کے لے جایا جا رہا ہے۔ اس طرح چور بھاگ گیا اور گھوڑا اپنے مالک کے پاس پہنچ گیا۔

اس واقعہ کے دس روز بعد وہ حادثہ ہُوا جس کا اثر آج بھی مجھ پر ویسا ہی ہے جیسا دھی صدی پہلے تھا۔ اختر کی ایک خالہ ہمارے گاؤں سے چار کوس سے کچھ زیادہ دُور ایک دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔ وہ خالہ کے سُسرال کا گاؤں تھا۔ اختر اپنی خالہ کے گھر گیا۔ ہلاکو کے ساتھ اسے بہت پیار ہو گیا تھا۔ وہ اسے بھی ساتھ لیتا گیا۔ وہ اپنے چچا کی گھوڑی پر گیا تھا۔ اکر کو ساتھ لے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ڈر تھا کہ اس کی ماں رات کو اسے کھلا کہیں غائب ہی نہ کر دے یا اسے کچھ کھلا کر مار ہی نہ دے ـــــ اختر چلا گیا۔ دوسرے ن کا پچھلا پہر گزرتا جا رہا تھا۔ سُورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ہم سب گاؤں کے ریب ایک پتھر اُٹھا رہے تھے۔ یہ ایک من وزنی پتھر تھا جس میں ہم نے اسے پکڑ کر اُٹھانے ے لیے جگہ تراشی ہوئی تھی۔ یہ ہماری روزانہ تمام کی ورزش ہُوا کرتی تھی۔ ایک آدمی نے ہا ـــــ "اللہ خیر کرے۔ ہلاکو اکیلا آ رہا ہے"۔

یہ آواز سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ ہم نے فوراً ہلاکو کو دیکھا تو ہم سب گھبرا گئے۔ ہلاکو آہستہ آہستہ دوڑتا آ رہا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا جس پر بڑے بڑے سیاہ دھبے تھے لیکن اس کے جسم کی سفیدی لال سُرخ تھی۔ ہم نے دوڑ کر اسے روکا۔ اُس نے منہ اُوپر کر کے ایسی

ہُوک لگائی کہ ہم پر عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔ اس ہُوک کو ہماری زبان میں "رُوڑ" کہتے ہیں جسے متوحش سمجھا جاتا ہے۔ یہ مصیبت کے وقت کا اعلان ہوتا ہے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ کُتے کو جن یا چڑیل نظر آتی ہے تو وہ منہ اُوپر کر کے لمبی ہُوک لگاتا ہے۔ ہلاکو نے اس سے پہلے ایسی متوحش آواز کبھی نہیں نکالی تھی۔ اس آواز کے بعد وہ اُدھر کو ہی چل پڑا جدھر سے آیا تھا۔ ہم نے یہی دیکھا کہ وہ سخت زخمی ہے لیکن اس کے زخموں کو ہم نے غور سے نہ دیکھا۔ وہ آگے جا کر رُکا۔ ہمیں دیکھا اور پھر ہُوک لگائی۔ ہم سمجھ گئے کہ اختر کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔

یہ واقعہ سنانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جو قارئین کُتوں کی فطرت اور نفسیات سے واقف نہیں انہیں دو چار باتیں بتا دوں ورنہ وہ اس واقعہ کو ناقابلِ یقین سمجھیں گے۔ ایک تو وہ آوارہ کُتے ہوتے ہیں جو گلیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کی دلچسپی صرف پیٹ کے ساتھ ہوتی ہے۔ ان کی عادتیں ایسی خراب ہوتی ہیں کہ لوگ صرف ان سے ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے کُتے سے نفرت کرتے ہیں۔ پالتو کُتے کی نفسیات مختلف ہوتی ہے۔ پالتو کُتوں میں شکاری اور لڑاکا کُتے ہر قسم کے حالات میں قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ مصیبت کے وقت انسان انسان کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اُس کا پالتو کُتا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ آخر دم تک اپنے مالک کے ساتھ مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے۔

ہلاکو جس طرح زخمی ہو کر اکیلا گاؤں میں آیا تھا اس سے ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ ایسے واقعات اس سے پہلے بھی ہو چکے تھے جن میں کُتے یا گھوڑے نے ہلاکو کی طرح گاؤں میں آ کر اطلاع دی تھی کہ اس کا مالک کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کُتے کی طرح گھوڑے میں بھی یہ خوبی ہوتی ہے کہ مالک کی مدد کرتا ہے۔ کُتوں کے تو میں ایسے بہت سے واقعات سُنا سکتا ہوں لیکن ہلاکو کا واقعہ سُنا دینا ہی کافی ہوگا۔ اس سے پہلے میں اپنے قریب کے ایک

گاؤں کا واقعہ سناتا ہوں۔ وہاں کے ایک گھرانے کی عداوت ایک اور گاؤں کے گھرانے سے تھی۔ ایک روز اُس گھرانے کا ایک بزرگ اپنی گھوڑی پر کہیں گیا۔ اس کے جانے کے نصف گھنٹہ بعد گھوڑی اکیلی گاؤں میں آئی اور زمین پر کھُر مارنے اور ہنہنانے لگی۔ گھر والوں نے گھوڑی کو سوار کے بغیر دیکھا اور اس کی یہ بے چینی دیکھی تو وہ اشارہ سمجھ گئے اور یہ بھی سمجھ گئے کہ سوار مارا گیا ہے۔ گھوڑی اُسی طرف دوڑ پڑی جدھر سے آئی تھی۔ گاؤں کے بہت سے آدمی اس کے پیچھے دوڑے۔ گھوڑی دو اڑھائی میل دُور ایک نشیبی جگہ جا کر رُک گئی۔ وہاں بہت سارا خون تھا مگر سوار نہیں تھا۔ بہت تلاش کیا مگر لاش بھی ملی نہ سوار کہیں زندہ نظر آیا۔ تیسرے روز لاش ایک گڑھے سے بھیڑیوں اور گیدڑوں نے نکال کر بہت ساری کھال تو سوار کے حشر کا پتہ چلا۔ اسے دشمن پارٹی نے گھات لگا کر قتل کیا تھا۔

اسی طرح ہلاکو گاؤں میں آیا تو ہمیں اس کے سوا اور کچھ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اختر کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ ہم نے ایک منٹ بھی ضائع نہ کیا۔ گھروں کو دوڑ پڑے۔ کلہاڑیاں اٹھائیں۔ کُتے کھولے اور ہلاکو کے پیچھے دوڑ پڑے۔ ہمارے ساتھ سولہ کُتے تھے۔ بیس کے قریب ہم نوجوان تھے اور اتنی ہی تعداد لڑکوں کی بھی ہمارے ساتھ آ گئی۔ سب لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ تین گھوڑے بھی ساتھ آ گئے۔ ہلاکو سے دوڑا نہیں جاتا تھا۔ وہ سخت زخمی تھا۔ اختر کے والد صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اس کی ماں دُور تک روتی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ اسے بڑی مشکل سے واپس بھیجا تھا۔ ہمیں دُور تک اس کے بَین سنائی دیتے رہے تھے۔ "ہائے میرا بچہ۔ ہائے میرا بچہ" — ہم نے ہلاکو کو تیز چلانے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم سے خون اس طرح گر رہا تھا جیسے پانی میں سے نکلو تو جسم پر سے پانی بہتا ہے۔

ہلاکو آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ جدھر مُڑتا تھا ہم بھی اُدھر ہی مُڑ جاتے تھے۔ وہ ہمیں کھڈ

نالوں اور اونچے نیچے راستوں سے اُس طرف لے گیا جس طرف سے لوگ نہیں گزرا کرتے تھے۔ وہ دراصل برساتی نالے کا خشک پاٹ تھا۔ وہاں اس کے دونوں طرف مٹی کے عمودی اور بلند ٹیلے تھے۔ اردگرد کا علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ وہاں درخت اور جھاڑیاں بہت تھیں۔ عمودی ٹیلوں میں غاریں تھیں جو دُور تک جاکر اوپر نکل جاتی تھیں۔ نالے کے پاٹ کے وہاں ایک دوسرے کے قریب دو موڑ تھے۔ وہاں کوئی چلا جاتے تو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ یہ جگہ ہمیں بھی خوفناک لگتی تھی۔ میں اس کی ہیبت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ ٹیلوں میں کٹی پھٹی ایسی جگہیں تھیں جہاں گیدڑ اور چمگادڑ چھپے رہتے تھے۔ لوگ تو یہ بھی کہا کرتے تھے کہ وہاں جنّ اور بھوت رہتے ہیں۔

ہلاکو آگے جاتے جاتے اس علاقے میں اُتر گیا۔ ہم اور ہمارے کتے اس کے پیچھے جا رہے تھے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہم سب اس خوفناک نالے میں اُتر گئے۔ سورج کی آخری زرد دھوپ سامنے والے ٹیلے کی چوٹی کے درختوں پر پڑ رہی تھی۔ ہم اور زیادہ نیچے اُترے تو ہلاکو ایک طرف مُڑ گیا۔ میں نے کلہاڑی کو مضبوطی سے پکڑ کر آگے کر لیا۔ ہم ہلاکو کے پیچھے مُڑے تو کوئی تیس پینتیس گز دُور ایک آدمی اوندھے منہ پڑا نظر آیا۔ ہلاکو نے رُک کر پھر آسمان کی طرف کیا اور اتنی لمبی ہوک لگائی کہ ایک لڑکے نے غصے سے بائیسکل گھما کر ہٹ سے چلا کر کہا "چپ اوئے ہلاکو"۔ ہم سب آدمی تک دوڑ کر پہنچے۔ اس کی پیٹھ خون سے لال تھی۔ اسے سیدھا کیا ــــ وہ اختر تھا۔ اس کا بھی جسم ہلاکو کی طرح خون سے لال سُرخ تھا۔ ہونٹوں اور دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ زندہ تھا۔ اس کی گھوڑی غائب تھی۔ وہ چچا کی گھوڑی پر خالہ کے گاؤں گیا تھا۔

اختر کے زخم دیکھے۔ کلہاڑیوں کے دو گہرے زخم پیٹھ پر تھے۔ ایک زخم دائیں کندھے

پر۔ یہ بھی گہرا تھا اور ایک زخم دائیں ران پر۔ یہ تو بہت ہی گہرا تھا۔ اس کی لاٹھی اس سے کچھ دُور پڑی تھی۔ اختر کے باپ کا حال بہت ہی بُرا ہو رہا تھا لیکن وہ مرد تھا۔ دانت پیس پیس کر کہتا تھا "تھانے نہیں جاؤں گا۔ اپنے ہاتھوں بدلہ لوں گا" ــــ ہم نے پگڑیاں اتار کر اختر کے زخموں پر کس کر باندھ دیں۔ ایک آدمی کو گھوڑے پر بٹھایا اور اختر کو اس کے آگے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ دو گھوڑے اور بھی تھے۔ انہیں اس کے ساتھ کر دیا اور کہا کہ وہ جتنی تیز چل سکیں چلیں اور شہر سول ہسپتال پہنچیں۔ کچھ آدمی اُن کے ساتھ سیدل بھی چلے گئے۔

انہیں رخصت کر کے اِدھر اُدھر دیکھا تو ہلاکو زمین پر پڑا نظر آیا۔ وہ بھی ہمیں اختر کی طرح عزیز تھا۔ میں اُس تک پہنچا مگر وہ مر چکا تھا۔ اس وقت ہم سب نے دیکھا کہ اس کے زخم بہت ہی گہرے تھے۔ بائیں پہلو میں کلہاڑی کا ایک زخم تھا۔ اس کی تین پسلیاں بھی کٹی ہوئی تھیں۔ پیٹھ پر بھی کلہاڑی کا ایک زخم تھا اور ایک زخم جو کم گہرا تھا پچھلی ٹانگوں کے اوپر پیٹھ پر تھا۔ وہ صرف اتنی دیر تک زندہ رہنا چاہتا تھا کہ ہمیں گاؤں سے اختر تک لے آئے۔ اس کا فرض ادا ہو چکا تھا اور اُس نے اختر کی اس نیکی کا صلہ بھی دے دیا تھا کہ اس نے خانہ بدوشوں سے لے کر اس کی جان بچائی تھی۔

میں نے اپنے دوستوں سے مل کر وہیں کلہاڑیوں سے قبر کھودی اور ہلاکو کو اس میں رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی۔ ہم نے باقاعدہ قبر بنا دی۔ اس دوران گاؤں کے دو آدمیوں نے خون کے دھبے زمین پر ایک طرف جاتے دیکھے اور وہ ان کو دیکھتے ہوئے آگے چلتے گئے۔ میں اور میرے نوجوان دوست بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ کسی کے پاؤں کے تازہ نشان صاف نظر آ رہے تھے اور اُس کا خون بھی زمین پر گرتا گیا تھا۔ دو اڑھائی سو گز

آگے گئے۔ سورج غروب ہو گیا تھا لیکن روشنی ابھی کافی تھی۔ عمودی ٹیلے میں ایک گُفا سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں ایک آدمی لیٹا ہُوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بیٹھ گیا اور اُس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ کچھ بولا نہیں۔ آگے ہو کر دیکھا تو اس کی ایک ٹانگ بہت ہی بُری طرح چیری پھاڑی ہوئی تھی۔ اس کے سینے سے بھی خون بہ رہا تھا اور اس کا ایک بازو بھی خون سے لت پت تھا۔ اس کے پاس ایک کلہاڑی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس سے پوچھا "کون ہو؟"

اس نے سرگوشی میں پانی مانگا۔

ڈرانے دھمکانے سے اس نے بتا دیا کہ اختر کو اُس نے اور اس کے دو ساتھیوں نے مارا ہے۔ اس کا ایک اور ساتھی اس سے چالیس پچاس گز دور اس سے بھی بُری حالت میں پڑا مل گیا۔ تیسرے کا کچھ پتہ نہ چلا۔ دوسرا آدمی بھی مان گیا۔ یہ تینوں گھوڑی چور تھے۔ اختر سے گھوڑی لینے کے لیے انہوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ تیسرا آدمی گھوڑی لے گیا تھا۔ ان دو آدمیوں کو اُٹھا کر گاؤں میں نہیں لے جا سکتے تھے کیونکہ یہ رہزنی کے مجرم تھے۔ انہیں موقعۂ واردات سے اُٹھانا ٹھیک نہیں تھا۔ ہم نے دو آدمی شہر کی طرف دوڑا دیئے تاکہ تھانے میں رپورٹ دے دیں۔ ان دونوں آدمیوں کو ہم نے ایک جگہ لٹا دیا۔ نالہ خشک تھا۔ ایک جگہ تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ وہاں سے ہم پگڑیاں پانی میں بھگو کر لائے اور پانی اُن کے منہ میں نچوڑا۔ ان کے زخموں پر انہی کی پگڑیاں باندھ دیں اور اُن سے پوچھتے رہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں اور کون ہیں۔ ان کی حالت بہت بُری تھی۔

صبح طلوع ہوئی۔ سورج نکلتے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ پولیس آ گئی۔ قریب کے ایک گاؤں سے چارپائیاں منگوا کر دونوں کو اُن پر ڈالا اور ہم سب باری باری اُٹھا کر شہر کے

ہسپتال تک لے گئے۔ اختر اسی ہسپتال میں تھا۔ اسے دیکھ کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ہوش میں آ گیا تھا لیکن ابھی بولنے کے قابل نہیں تھا۔ دونوں زخمی ملزموں پر پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا۔ بہت دنوں بعد وہ دونوں اور اختر بیان دینے کے قابل ہوئے۔ ان دونوں نے اقبالِ جُرم کر لیا۔ یہ واردات اس طرح ہوئی کہ اختر گھوڑی پر سوار اپنے گاؤں کو واپس آ رہا تھا۔ اُس نے شام سے پہلے گھر پہنچنے کے لیے یہ خطرناک راستہ اختیار کر لیا۔ اسے اپنی جوانی اور اپنی دلیری پر بھروسہ اور ناز تھا۔ ہلاکو اس کے ساتھ تھا جس کی اس نے زنجیر کھول رکھی تھی۔ اختر کے پاس لاٹھی تھی۔ وہ اس نالے میں سے گزر رہا تھا کہ تین آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور اسے کہا کہ گھوڑی ہمارے حوالے کر دو اور تم جاؤ۔ ان تینوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔

اختر گھوڑی سے کُود آیا۔ اس نے کہا "گھوڑی یہ کھڑی ہے۔ میں اکیلا اور تم تین ہو۔ مرد ہو تو پہلے مجھے ختم کرو پھر گھوڑی لے جانا" ـــــ اُس نے تینوں کو للکارا اور لاٹھی سے تین کلہاڑیوں کا مقابلہ کیا۔ اختر کو اُس وقت بالکل توقع نہیں تھی کہ ہلاکو اس کی مدد کرے گا۔ اس نے کلہاڑیوں کے وار لاٹھی پر روکے اور لاٹھی ماری بھی۔ وہ آخر تین تھے۔ ایک نے پیچھے سے اس کی پیٹھ اور کندھے پر کلہاڑی کے بڑے سخت وار کیے۔ اُس وقت ہلاکو حرکت میں آیا۔ اُس نے ایک آدمی کی تو ایک ٹانگ ہی چبا لی۔ دوسرے آدمی نے ہلاکو کو کلہاڑی سے بُری طرح زخمی کر دیا۔ ہلاکو نے اتنے گہرے زخم کھا کر دوسرے آدمی کے پہلو میں دانت اور پنجے گاڑ کر اس کی ایک پسلی چکنا چُور کر دی اور پیٹ پھاڑ ڈالا۔ اس دوران اختر نے لاٹھی سے ان دونوں کو سروں پر وار کر کے گرا دیا۔ تیسرا آدمی اس لڑائی سے نکل کر گھوڑی پر سوار ہُوا اور بھاگ گیا۔

اختر کے زخم بہت گہرے تھے۔ اسے غشی آ گئی اور وہ گر پڑا۔ دو رہزن وہاں سے بھاگنے لگے۔ ہلاکو نے اختر کو سونگھا اور گاؤں کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بہت ہی بُری طرح زخمی تھا۔ دونوں رہزنوں نے بیان دیا کہ وہ چند قدم چلے تو ایک گر پڑا۔ دوسرا چلتا گیا اور وہ بھی گر پڑا۔ پھر وہ ایک دوسرے سے الگ الگ ہو کر رینگتے رہے اور جب زخموں نے رینگنے سے بھی معذور کر دیا تو وہ چھپ گئے۔ ہلاکو گاؤں میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ ان دونوں آدمیوں نے پولیس کے پاس اپنے تیسرے آدمی کی نشاندہی کی۔ اس کی گرفتاری کے لیے پولیس بھیج دی گئی۔ ان کے بیان کے مطابق یہ مویشی اور گھوڑے چوری کرنے والا گروہ تھا۔ یہ زیادہ تر گھوڑے چوری کرتے تھے۔ ایک جگہ سے گھوڑا یا کوئی مویشی چوری کر کے دُور دراز کہیں لے جا کر بیچ دیتے تھے۔ وہ خوشاب کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ ہر قسم کی پنجابی حبس میں بولتے تھے۔ پوٹھوہاری بھی شامل تھی۔ بول سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی کچھ وارداتیں بھی سنائیں۔

تیسرا آدمی لاپتہ ہو گیا تھا۔ دس بارہ دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ آدمی گھوڑی سمیت سرگودھا سے پکڑا گیا۔ اتفاق سے وہ اس آدمی کے ہاتھ گھوڑی بیچ رہا تھا جو وہاں کی پولیس کا مخبر تھا۔ اسے شک ہوا اور اس نے اسے پکڑوا دیا۔ اسے ہمارے تھانے میں لایا گیا۔ اختر کے زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔ اسے اس آدمی کی شناخت کے لیے تھانے بلایا گیا۔ اختر اسی صبح ہسپتال سے فارغ ہوا تھا اور ہم اسے گھوڑے پر بٹھا کر لاتے تھے۔ ہم سب دوست اسے پھر شہر لے گئے۔ اس کے والد صاحب بھی ساتھ تھے۔ ہم تھانے میں گئے تو وہاں تیسرا چور دیکھا۔ اُسے دیکھتے ہی ہم میں سے تین چار لڑکے ایک ہی وقت بول اُٹھے ——"ارے۔ یہ تو وہی ہے"—— یہ وہ آدمی تھا جس کے

گھوڑے پر ہلاکو اور کبیلی نے حملہ کیا تھا اور یہ گھوڑے سے کُود کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ یہ افضل کے والد صاحب کے ایک دوست کا گھوڑا تھا جو اُس نے رات کے وقت کھرلی سے کھولا تھا مگر راستے میں ہمارے کُتوں نے اُس سے گھوڑا چھین لیا۔

جب مقدمہ چلا تو ہماری شکار پارٹی کے سات لڑکے بھی گواہی دینے گئے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ بہت ہی دلچسپ مقدمہ تھا۔ مجسٹریٹ ہندو تھا۔ وہ گھوڑے پر کُتوں کے حملے کی تفصیل سُن کر ہنستا تھا۔ اس نے تینوں ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا جہاں سے انہیں سات سات سال قید کی سزا ملی۔

اختر کے زخم مل گئے۔ دونوں گھوڑی چوروں کے زخم بھی ٹھیک ہو گئے ہوں گے لیکن اختر کے دل میں، میرے دل میں اور میرے تمام شکاری دوستوں کے دلوں میں ہلاکو ایسا گہرا زخم چھوڑ گیا جو آج تک نہیں ملا۔

میں یہ کہانی نہیں سنانا چاہتا تھا۔ آج ہمت کی ہے مگر دل کا زخم کھل گیا ہے۔ ہلاکو کے ساتھ وہ سارے ہی دوست یاد آ گئے ہیں جو ایک ایک کر کے قبرستان میں جا کر سو گئے ہیں۔ ہلاکو کی ہڈیاں اس برساتی نالے میں جہاں ہم نے اسے دفن کیا تھا، اگلے ہی ساون کے سیلاب میں بہ گئی تھیں مگر اس کی یاد جو میرے دل میں ہے وہ آنسوؤں کے سیلاب میں نہیں بہ سکی۔ آج تک نہیں بہ سکی۔